ماہنامہ

ترجمان القرآن

دسمبر ۱۹۹۳ء

جاری کردہ :

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

ترجمۂ قرآنِ مجید

مع مُختصر حواشی

سیّد ابُوالاعلیٰ مودُودی

اس میں مترجم نے قرآنِ حکیم کے متن اور
تفہیم القرآن کے ترجمے کے ساتھ بہت مختصر حواشی
درج کر دیے ہیں تاکہ عام لوگ جو قرآنِ مجید کا سیدھا سادہ
مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں وہ ایک ہی جِلد میں

تفہیمُ القرآن

کے خلاصے سے فائدہ اٹھا سکیں

سائز: ۲۳×۳۶/۱۶ ● صفحات: ۱۵۸۴ ● ھدیہ: -/۱۷۵ روپے

إدارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ

اردو بازار، لاہور

فون: ۲۳۴۰۱۴ - ۲۳۶۶۶۵ ● پوسٹ بکس نمبر: ۱۴۴۳

جلد ۱۱۹ — دسمبر ۱۹۹۳ — عدد ۱۲

ماہنامہ

ترجمان القرآن

جاری کردہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اچھرہ، لاہور (پاکستان)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۔ ۵۳۴۰

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

جلد ۱۱۹ عدد ۶

دسمبر ۱۹۹۳ جمادی الثانی ۱۴۱۴

فہرست مضامین

اشارات	خرم مراد	۳
حکمتِ مودودیؒ گمراہی کے غلبہ میں اہلِ حق کی روش		۱۲
ایمان کیا ہے؟	مولانا بدر عالم میرٹھی	۱۴
ہادم اللذات کمزور حافظہ کی ایک تاریخی مثال	افادات مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ	۲۰
مسلمان، مسندِ اقتدار پر	مولانا عبد السلام قدوائی	۲۷
یونان اور البانوی تارکینِ وطن کا مسئلہ	محمد الیاس انصاری	۴۰
رسائل و مسائل		۴۴
انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی،		
مرکزی شوریٰ کے حالیہ فیصلے		
مطبوعات		۵۱

دخل در معقولات، اقامتہ الصلوٰۃ، مسافرانِ راہِ وفا (حصہ اوّل)، مسلم امتہ پر قوم پرستی کے اثرات،
منصوبہ بلا سود عوامی بینکاری، مرادِ مصطفیٰؐ، قرآن کا عائلی قانون، اوج، قرار دادِ پاکستان گولڈن جوبلی نمبر،

برائے ادارتی امور: منصورہ، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۷۰، فون نمبر ۷۵۷۰۴۳۴-۸ فیکس (۰۴۲) ۷۵۷۴۱۹

برائے انتظامی امور: رحمٰن مارکیٹ، اردو بازار، لاہور ۵۴۰۰۰، فون نمبر ۷۲۳۴۰۴۳-۷۲۳۶۲۶۵

پوسٹ بکس نمبر: ۳۴۳

زر سالانہ بذریعہ منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ مینجر ترجمان القرآن لاہور کے پتہ پر ارسال فرمائیں۔ کراس چیکس قابل وصول نہ ہوں گے۔

قیمت فی شمارہ -/۶ روپے ○ زر سالانہ: ۶۰ روپے (اندرون ملک)

عرب ممالک، خلیجی امارات و برصغیر: ۲۰ ڈالر یورپ: ۲۵ ڈالر امریکہ و آسٹریلیا: ۲۵ ڈالر

سید حسین فاروق مودودی نے ملک عبد محمد پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر دفتر "ترجمان القرآن" اچھرہ، لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

خرّم مراد

تنظیم اور اجتماعیت کے ذریعہ ہی انسان وہ عظیم اور دشوار مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں' جن کا حصول ناگزیر ہے' مگر جن کو الگ الگ رہ کر انفرادی طور پر حاصل کرنا ممکن نہیں۔ یہ معاملہ صرف جہاد کے ذریعہ اعلاءِ کلمتہ اللہ' قیامِ قسط' ایک اور جہانِ نو کی تعمیر جیسے اجتماعی مقاصد ہی کا نہیں۔ ایک فرد کا سب سے اہم اور بڑا ذاتی مطلوب ---- یعنی اپنی خداداد شخصیت کا تزکیہ و تربیت' اس کی ترقی و تکمیل کی جستجو' اور دنیا و آخرت میں اپنی فوز و فلاح ---- بھی اجتماعیت کے بغیر پوری طرح ممکن نہیں۔ اسی لیے مسجد میں با جماعت نماز ۲۷ گنا افضل ہوئی' مسجد کی طرف اٹھنے والے ہر قدم پر نیکیوں میں اضافے اور گناہوں کے مٹنے کی بشارت دی گئی' اور فجر اور عشا کی با جماعت نمازیں آدھی آدھی رات کے قیامِ لیل کے برابر ٹھہریں۔ اسی لیے حج جیسی دشوار مگر عاشقانہ عبادت کا رکنِ اعظم میدانِ عرفات کے اجتماعِ عظیم میں حاضری قرار پایا۔ اسی لیے' اس کے بغیر کہ کوئی واضح حکم جماعت سازی کا نازل ہوتا اور اس کے لیے دستور اور قواعد و ضوابط نازل کیے جاتے' روزِ اوّل سے قرآنِ مجید نے خطاب کیا تو "اے ایمان لائے والو" کہہ کر کیا' گویا ایمان کے اپنے اندرونی و فطری تقاضے کے نتیجہ میں ایک اجتماعی گروہ وجود میں آچکا تھا جو اس کے روبرو موجود تھا۔

لیکن یہ بات بالکل واضح ہے' اور ہرگز کبھی بھی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے' کہ تنظیم خود مقصود و محبوب نہیں' نہ تنظیم برائے تنظیم کا کوئی جواز ہو سکتا ہے۔ وہ اس لیے' اور صرف اس لیے' اہم اور محترم ہے کہ فرد کے تزکیہ' اس کی اخروی و دنیوی فوزوفلاح اور قیامِ حق و قسط جیسے فی نفسہٖ مطلوب و محبوب مقاصد کے حصول کا ناگزیر ذریعہ ہے۔ اجتماعیتوں کا مقدر بالآخر فنا ہے' افراد کے لیے موت کے بعد وہ حیات ہے جس میں موت نہیں۔ اگر تنظیم کے ذریعہ فرد کو

اپنے تزکیہ میں مناسب مدد نہ مل رہی ہو' یا نظامِ حق کے قیام کی طرف پیش رفت نہ ہو رہی ہو' تو وابستگانِ تنظیم کو سب سے پہلے تنظیم کی اصلاح کی فکر کرنا چاہیے۔

تنظیم کی قوت اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے کارگر ہونے کا راز کیا ہے ؟

تنظیم کی قوت اور ترقی و توسیع کا راز محض دستور اور قواعد و ضوابط میں نہیں' اگرچہ قواعد و ضوابط کی پابندی اس کی بقا و تحفظ کے لیے ضروری ہے۔ ایسی تنظیمیں' بلکہ مملکتیں موجود ہیں' جو کسی تحریری دستور اور قواعد و ضوابط کے بغیر ہی پھلی پھولی ہیں۔ بلکہ تحریری دستور تو دورِ جدید کی پیداوار ہے۔

تنظیم کی قوت کا انحصار صرف معیاری افراد کی بھرتی پر بھی نہیں' اگرچہ اپنے سے وابستہ افراد کو اپنے مطلوبہ مقصد کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے رہنا اس کے لیے ضروری ہے۔ ایسی جماعتوں نے بھی قوت حاصل کی ہے' اور عظیم الشان کارنامے سرانجام دیے ہیں' جنہوں نے داخلہ کے لیے کسی معیار کا مطالبہ نہیں کیا' بلکہ داخلہ کے بعد انسانوں کے سامنے ان کی استعداد و استطاعت کے مطابق معیارِ مطلوب رکھ کر ان پر پورا اترنے کا مطالبہ کیا۔ اور اس کام میں ان کی مدد کی۔ اس کی بہترین مثال خود ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت ہے۔

تنظیم کی قوت کی بنیاد وہ قول و قرار اور عہد و پیمان بھی نہیں جس کی بنیاد پر لوگ تنظیم میں شامل ہوتے ہیں' اگرچہ ہر تنظیم کسی رسمی یا غیر رسمی عہد و پیمان ہی پر قائم ہوتی ہے۔ یہ اس لیے کہ آدم کی سرشت میں نسیان اور عزم کی ناپختگی داخل ہے۔ وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا تھا' مگر وہ بھول گیا' اور ہم نے اس میں عزم نہ پایا۔ طہٰ ۲۰ : ۱۱۵)۔ نسیان اور عزم کی کمی کی وجہ سے بھی' اور بعض دفعہ قلب میں نفاق کے مرض کی وجہ سے بھی' عہد و پیمان کی قیمت دو بول یا کاغذ کے ایک ٹکڑے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ ورنہ خود ایمان سے بڑا' محکم اور مقدس عہد کیا ہو سکتا ہے' مگر اس کے باوجود ایمان کے تقاضے کتنے لوگ اور کس حد تک پورے کرتے ہیں۔

تنظیم کی قوت و توسیع صرف سرگرمیوں سے بھی حاصل نہیں ہوتی' بالخصوص تنظیمی سرگرمیوں سے' اور ان سے جو محض برائے سرگرمی ہوں۔ اجتماعات' تقاریر' مہمات' جلسے' جلوس' منصوبے' چلت پھرت --- اگرچہ ضروری ہیں --- لیکن فی نفسہٖ اس بات کی علامت نہیں کہ تنظیم قوی اور موثر ہے۔

تنظیم کی قوت محض ڈسپلن، اطاعتِ امر، کنٹرول اور ایک کسے ہوئے نظم کی مرہونِ منت بھی نہیں، اگرچہ سمع و طاعت کے بغیر کوئی تنظیم مضبوط نہیں ہوسکتی۔ لیکن فوج سے زیادہ سخت ڈسپلن کہاں ہوگا، فوجیں بھی مورال کی کمزوری سے ہار جاتی ہیں۔ فوج کے طرز پر بنی ہوئی پارٹیاں بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔

پھر تنظیم کی قوت کا اصل راز کس چیز میں پوشیدہ ہے؟

تنظیم افراد پر مشتمل ہوتی ہے، جس طرح ایک دیوار اینٹوں سے بنتی ہے۔ اس کی قوت اور زندگی اس بات پر منحصر ہے کہ اس سے وابستہ افراد اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنے طور پر، از خود، صحیح طریقہ سے کام کرنے کی استعداد اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ کسی خارجی دباؤ، بالائی ہدایت، کنٹرول اور احتساب یا ایسے ہی رسمی اوز مصنوعی ذرائع و تدابیر کے منتظر و محتاج نہ ہوں۔

وہ خود جانتے ہوں کہ کیا کام کرنا ہے، اور کن حدود کی پابندی کرنا ہے۔ خود ہی اپنے مقصد کے حصول کے لیے فکر مند ہوں، خود ہی سوچیں کہ وہ کیا کرسکتے ہیں، خود ہی اپنے منصوبے بنائیں، خود ہی ان کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تگ و دو کریں، خود ہی اپنے اوپر نگاہ کریں، اپنے سے رپورٹ لیں، اپنا احتساب کریں، اور خود ہی اپنے کو ٹھیک کریں اور ٹھیک رکھیں۔ ہر فرد تو ایسا نہیں بن سکتا، مگر جس قدر یہ کیفیت حاصل ہوگی، اور جتنے زیادہ افراد میں ہوگی، اتنی ہی تنظیم طاقت ور اور مؤثر ہوگی۔ جتنا افراد نظم میں جکڑے اور کسے ہونے کی بنا پر کام کریں گے، حکم اور ہدایت کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھنے والے ہوں گے، یکساں اور لگے بندھے کام ہی کرنے کے عادی ہوں گے، اتنی ہی تنظیم کمزور اور غیر مؤثر ہوگی، افراد غیر فعال ہوتے جائیں گے، اور بالآخر خود نظم، اور ہدایت و کنٹرول کی ساری تدبیریں بھی ان کو متحرک کرنے میں ناکام ثابت ہوں گی۔

نظم کے دباؤ اور رسمی و مصنوعی تدابیر کے بغیر از خود کام کرنے والے افراد وہی ہوسکتے ہیں جن میں اپنے مقصد کے ساتھ بھرپور وابستگی، محبت اور وفاداری موجود ہو۔ اور یہ افراد ایک ایسی تنظیم ہی میں پوری طرح نتیجہ خیز ہوسکتے ہیں، جہاں تنظیم کے وسائل اور سرگرمیاں اپنے مقصدِ اصلی کے لیے وقف ہوں۔ یہ نہ ہو کہ تحریر و تقریر میں مقصد کا مقام سب سے اعلیٰ ہو، لیکن وسائل و سرگرمیوں میں اس کا حصہ اتنا کم ہو کہ وہ مقصد مدھم پڑجائے، اوجھل ہو جائے، یا تبدیل ہو جائے۔

زندگانی را بقا از مدعا است
کاروانش را درا از مدعا است

اسی لیے قرآن میں فرمایا گیا کہ "اللہ نے ایمان کو تمھارے لیے محبوب کردیا' اور اسے تمھارے دلوں کی زینت بنا دیا" (الحجرات ۴۹ : ۷)۔ کیونکہ ایمان دراصل زندگی کا قبلہ' راستہ اور منزل متعین کرلینے کا نام ہے۔ ایمان کا مرکز کیوں کہ خود اللہ تعالیٰ ہے' اس لیے فرمایا کہ "جو (حقیقت میں) ایمان لاتے ہیں وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں" (البقرہ ۲ : ۱۶۵)۔ اسی لیے نبی کریمؐ نے فرمایا کہ "تم میں سے کوئی شخص (مطلوبہ درجہ کا) مومن نہیں ہو سکتا' جب تک کہ میں اس کی نگاہ میں اس کے باپ' اس کے بیٹے اور سارے انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔" اسی لیے آپؐ نے فرمایا کہ "جس نے محبت کی تو اللہ کے لیے اور ناراض ہوا تو اللہ کے لیے' اس نے اپنا ایمان کامل کرلیا۔" اسی لیے قرآن نے کہا ہے کہ "مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں" (الحجرات ۴۹ : ۱۰)۔ اور یہ کہ "اس نے ان کے دل ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ الفت میں جوڑ دیے ہیں" (الانفال ۸ : ۶۳)۔

اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ اس درجہ میں محبت و وابستگی ہو' تو اس کی راہ میں جہاد کے ذریعہ ان کی نصرت' اور اعلاءِ کلمتہ اللہ کے کام سے بھی اسی درجہ میں محبت ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہرچیز سے بڑھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرنے کی تعلیم دی' تو ان کے ساتھ جِھَادٍ فِیْ سَبِیْلِہٖ کو بھی جوڑ دیا (التوبہ ۹ : ۲۴)۔ محبت کے سوتے دل کے اندر ہوتے ہیں' اور اسی لیے محبت ہو تو اللہ کا کام تن من دھن سے کرنے کا چشمہ بھی دل کے اندر سے ابلتا ہے۔

تنظیم میں جان اور زندگی پیدا کرنا ہے' اس میں شامل افراد سے وہ کام کروانا ہے جس کے لیے تنظیم بنی ہے' تو زیادہ سے زیادہ افراد کے دلوں میں مقصد سے محبت و وابستگی کا یہ تعلق پیدا کرنے پر اپنی توجہات اور کوششیں مرکوز کردینا چاہئیں۔ ملاقاتوں میں' اجتماعات میں' گفتگوؤں میں' تقریروں میں یہی موضوع غالب ہونا چاہیے' اپنے اعمال کو بھی اسی کا مظہر ہونا چاہیے' اور اسی کو پیدا کرنے والے اعمال کی ترغیب دینا چاہیے۔ تنظیم کا کلچر اور اجتماعی ماحول بھی اسی کو نشوونما دے' اور اس کے برعکس صورتحال کو قبول نہ کرے۔

عقل رہنما ہے' اور دلیل سے آدمی صحیح راہ پاتا ہے۔ لیکن محض دلیل اور عقل کا تعلق بڑا کمزور تعلق ہوتا ہے۔ اس کے تاروپود بہت جلد بکھر جاتے ہیں۔ دل کا تعلق اور محبت کا تعلق پائیدار اور مضبوط ہوتا ہے' اور اگر عقل کی رہنمائی میں قائم ہو' تو صحیح بنیادوں پر قائم رہتا ہے۔

کوئی انسان اجتماعیت اور ماحول سے بے نیاز نہیں ہو سکتا' ہر انسان کو محبت کا یہ تعلق پوری طرح حاصل نہیں ہو سکتا' اور اس تعلق کی بقا و نشوونما کے لیے بھی اجتماعی سرگرمیاں ضروری ہیں' لیکن جہاں جس درجہ میں یہ تعلق ہوگا' وہاں اسی درجہ میں یہ قوت اور استعداد پیدا ہوگی کہ فرد خود اپنے طور پر اپنے مقصد کے لیے کوشاں اور سرگرم رہے۔ یہ تعلق نہ بے وفائی کا ننگ برداشت کرتا ہے' نہ پسپائی اختیار کرتا ہے' نہ یاس کا شکار ہوتا ہے' نہ اس کو خارجی ذرائع اور دباؤ کی ضرورت ہوتی ہے۔ محبت و وابستگی کا تعلق ہو' تو تنظیم تنازع اور اندرونی انتشار سے بھی بچی رہتی ہے اور اختلافات کے تناؤ کو بھی سہار لے جاتی ہے۔

لیکن صرف از خود کام کرنے کی استعداد اور جذبہ کافی نہیں' صحیح اور بہترین کام کرنے کی صلاحیت بھی درکار ہے۔ اس مقصد کے لیے ٹریننگ بھی ضروری ہے' مگر سب سے زیادہ نافع یہ ہے کہ افراد یہ اچھی طرح سمجھ جائیں کہ کیا ہدف ہے' کہاں پہنچنا ہے' کن حدود کا پابند رہنا ہے' کیا چیزیں تنظیم کے کلچر میں قابلِ قبول ہیں اور کیا ناقابلِ قبول' اور اس کے بعد ان کو یہ اختیار اور آزادی ہو کہ اپنی اپنی ذمہ داری کی حد تک تو وہ خود اپنا ہدف حاصل کرنے کے لیے کام کریں۔ اس راہ میں بالکل لگے بندھے طریقوں سے کام کرنے کے بجائے تنوع' اور ہر کام کے ٹھیک ٹھیک نظم کے حکم کے مطابق کروانے کے بجائے کچھ کوتاہیاں اور لغزشیں برداشت کی جائیں' اور اوپر سے احکام جاری کر کے اصلاح کے بجائے افراد میں یہ صلاحیت و استعداد پیدا کی جائے کہ وہ از خود اپنی اصلاح کر لیں۔

تنظیم کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے مقصد کو مقصد کی جگہ رکھے۔ اس کی علامت یہ ہے کہ وہ اپنے وسائل اور سرگرمیوں کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے مقصد کے حصول کے لیے لگائے۔ تنظیموں کو یہ حادثہ پیش آسکتا ہے کہ دستور و تقریر میں مقصد صحیح رہے' لیکن عملاً وہ مدھم پڑ جائے' یا اس کی جگہ دوسری چیزیں مقصد بننا شروع ہو جائیں۔

جس چیز کے مقصد بن جانے کا خطرہ سب سے بڑھ کر پیش آسکتا ہے' وہ خود تنظیم ہے۔ کیونکہ تنظیم کے بغیر حصولِ مقصد ممکن نہیں ہوتا' اسی لیے تنظیم بھی اتنی ہی اہم ہوتی ہے جتنا مقصد۔ لیکن وہ بہرحال ذریعہ ہے۔ جب وہ خود مقصد بننا شروع ہو جائے تو وسائل اور انسانوں کے وقت اور قوتوں کا روز بروز بڑھتا ہوا حصہ مقصد کی طرف پیش رفت کے بجائے تنظیم کو قائم رکھنے' چلانے اور بچانے میں لگنے لگتا ہے۔

جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے' تو تنظیم کا ہر کل پرزہ اور اس کی ہر حرکت اپنی جگہ بالکل صحیح بلکہ ضروری لگتی ہے' مگر مقصد کی طرف پیش رفت نہیں ہوتی۔ پھر تنظیم کی مثال ایک ایسی گاڑی کی ہو جاتی ہے جس کا ہر حصّہ اپنی جگہ ٹھیک ہو' مسافر بھی بیٹھے ہوں' ڈرائیور بھی موجود ہو' اس کے ہاتھ میں اسٹیرنگ بھی ہو' انجن بھی چل رہا ہو' پٹرول بھی ڈالا جارہا ہو' لیکن گاڑی آگے نہ بڑھ رہی ہو' اور اگر چل بھی رہی ہو تو ایک سال میں ایک چکر کاٹ کر اسی مقام پر آکر کھڑی ہو جاتی ہو جہاں گزشتہ سال تھی۔ اگر آپ دیکھیں کہ عہدیدار بھی ہیں' منصوبے بھی ہیں' دفاتر بھی ہیں' سرکلر بھی ہیں' اجتماعات بھی ہیں' دورے بھی ہیں' تقریریں بھی ہیں' درس بھی ہیں' تربیت گاہیں بھی ہیں' بیت المال بھی ہیں' آمد و خرچ بھی ہے' لیکن انسانوں کے کردار اور صلاحیتوں میں کوئی خاص بہتری نہیں ہو رہی' اور جو دعوت لے کر تنظیم بنی ہے اس کے اثر و نفوذ میں کوئی قابلِ ذکر اضافہ نہیں' تو پھر یہ ایک ایسا تشویش ناک امر ہے جو ہماری فوری توجہ کا محتاج ہے۔

اس کے علاج کے لیے' زبردست اجتہادی قوت سے کام لے کر ہمیں' پرہیز بھی کرنا ہوگا اور دوا بھی۔ دل پر پتھر رکھ کر' ایسے بے شمار کام ترک کرنا ہوں گے جو ماضی میں ہمیں بہت عزیز رہے ہیں' جن کے بغیر ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارا کام چل نہیں سکتا' لیکن جن کی اب صرف صورت باقی رہ گئی ہے' حقیقت گم ہو چکی ہے۔ یہ کام اب منزل کی طرف پیش رفت میں کوئی حصّہ ادا نہیں کر رہے' بلکہ بعض صورتوں میں وسائل اور قوتوں کا ضیاع کر رہے ہیں اور ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اسی طرح ہمیں ایسے نئے کام بھی کرنا ہوں گے جن سے اگرچہ ہم مانوس نہ ہوں' لیکن وہ آج ہمیں اپنی منزل کی طرف جانے میں ممدومعاون محسوس ہوں۔

تربیت کا معاملہ بھی گہرے غور و فکر کا محتاج ہے۔

یہ اصول تو بنیادی طور پر مسلّمہ ہے کہ اپنی تربیت آپ ہی ہو سکتی ہے' ہر شخص خود اپنی تربیت کے لیے ذمہ دار ہے۔ وہ اکیلا ہی اپنے رب کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے کارنامۂ زندگی کی جواب دہی کرے گا' اور اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کا الزام نہ تقدیرِ الٰہی پر ڈال سکے گا اور نہ شیطان پر' نہ ماحول پر اور نہ گمراہ کرنے والوں پر۔ کوئی کسی کا بوجھ نہ اٹھائے گا' اور کوئی اپنی کمائی کے نتائج سے نہ بچ سکے گا' نہ محروم رہے گا۔ اس لیے جب تک افراد خود اپنی زندگی کی باگ اپنے ہاتھ میں لے کر عمل کی راہ پر گامزن نہ ہوں گے' اس وقت تک کوئی تقاریر و تدابیر اور تربیتی پروگرام انہیں نفع نہیں پہنچا سکتے۔

لیکن اگر افراد یہ کام بغیر جماعت اور اجتماعی ماحول کے کرسکتے تو پھر انہیں جماعت میں شمولیت کی کیا حاجت تھی ؟ اس لیے جماعت کا فرض ہے کہ وہ افراد کو ایسے تمام وسائل فراہم کرے جن سے ان کو اپنی شخصیت کا تزکیہ کرنے میں پوری پوری مدد ملے۔ ایک فرد جماعت میں شامل ہو' لیکن اس شمولیت سے اسے اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں کوئی مدد نہ ملے' اور برسوں گزارنے کے بعد بھی وہ اسی مقام پر رہے جہاں آغاز میں تھا' تو یہ سودا اس کے لیے نفع کا سودا نہ ہوگا۔

یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ تزکیہ کے لیے صحیح علم ناگزیر تو ہے' لیکن یہ کافی نہیں۔ لوگ گناہ اور غلطیاں صرف اس لیے نہیں کرتے کہ وہ علم نہیں رکھتے' بلکہ اکثر اس لیے کرتے ہیں کہ ایسا کرتے ہوئے وہ غافل ہو جاتے ہیں' (اور "ایمان ان کے اندر سے نکل جاتا ہے" جیسا نبیؐ نے فرمایا)' ان کا ارادہ اور عزم کمزور پڑ جاتا ہے' وہ شیطانی وساوس کا شکار ہو جاتے ہیں' یا وہ اپنے اعمال کی اچھی تاویل کرلیتے ہیں۔ ہر انسان کے ساتھ شیطان لگا ہوا ہے' اس لیے کسی جماعت کو اس سے مفر نہیں کہ اس سے وابستہ افراد سے گناہ سرزد ہوں۔ جو ایسے معیاری انسانوں کی تلاش میں ہو' اسے سب سے پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے۔ بہت تربیت یافتہ ہونا بھی اس کی ضمانت نہیں کہ لغزش سرزد نہ ہوگی۔ انسانوں کے ذریعہ' انسانوں کے درمیان اصلاح کا کام کرنے کے لیے' اور ایسے ہی انسانوں کے معاشرہ پر نظامِ حق قائم کرنے کے لیے انسانی فطرت کی اس حقیقت کا ادراک بھی بہت ضروری ہے۔

تربیت کے لیے' علم کے بعد دو ہی چیزیں کلیدی مقام رکھتی ہیں۔ ایک' فرد کا اپنا ارادہ اور سعی۔ دوسرے 'صالح ماحول اور صحبتِ تقریر۔ درس' مطالعہ' تربیتی پروگرام --- ان سب کا ہدف انہی دو چیزوں کی افزائش اور نشوونما ہونا چاہیے۔ جماعتی ماحول ایسا ہو جہاں نیکیاں پروان چڑھیں اور برائیاں اس طرح ناقابلِ قبول ہوں کہ انسان کو کرنے کی ہمت بھی نہ ہو۔

اصلاح و انقلاب کے لیے جو بھی تدبیر اختیار کی جائے اس کے ذریعہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے ہرحال میں انسان درکار ہوں گے۔ ان کے دل جیتنا ہوں گے۔ ناکامی کے معنی لازماً تدبیر کی خرابی نہیں' یہ انسانوں کو اپنے ساتھ نہ لے سکنے کی وجہ سے بھی ہوسکتی ہے۔ افراد اور معاشروں میں اصلاح و انقلاب کا اصل مسئلہ ہی یہ ہے کہ بگڑے ہوئے انسان کے اندر ہی وہ قوت پیدا کرنا ہوتی ہے جس سے وہ اپنی اصلاح کرے' اور بگڑے ہوئے انسانوں کے معاشروں ہی میں سے وہ انسان فراہم کرنا ہوتے ہیں جو انسانوں اور معاشروں کی اصلاح کردیں' اور اچھے برے ہر قسم اور ہر

رنگ کے انسانوں کے اوپر ہی نظامِ حق قائم کرنا ہوتا ہے۔ اس بنیادی حقیقت کو پوری طرح نہ سمجھنے یا ملحوظ نہ رکھنے ہی کی وجہ سے لوگ فکرو عمل میں کجی یا یاس کا شکار ہو جاتے ہیں۔

ہم ایک بگڑی ہوئی مسلم امّت کے درمیان اصلاح و انقلاب کے کام کے لیے کھڑے ہوئے ہیں۔ ہمیں اسی امّت میں سے وہ سرمایہ فراہم کرنا ہوگا جو یہ کام کرسکے' اور خود اسی امّت کو اپنی اصلاح کا ذریعہ بنانا ہوگا۔ امّت کے درمیان اگر ہم نے جماعت بنائی تھی' تو سیّد مودودیؒ کے الفاظ میں

> ہم اپنی کوئی الگ جماعت بنانا نہیں چاہتے تھے بلکہ ہماری خواہش یہ تھی کہ مسلمانوں میں اس چیز [اپنے اصل مقصدِ وجود اور اس کے لیے جدّوجہد] کا صحیح احساس پیدا ہو . . . ہم نے جماعت اس وقت بنائی جب ہماری ۹ سال کی مسلسل تبلیغ و تلقین کے باوجود مسلمانوں نے من حیث القوم اس راہ کو اختیار نہ کیا جسے ہم پیش کر رہے تھے۔ (جماعتِ اسلامی کا مقصد' تاریخ اور لائحہ عمل' ص ۳۶ - ۳۷)

یہی بات انھوں نے ۱۹۵۱ میں جماعت کے دستور پر گفتگو کرتے ہوئے یوں کہی'

> اس جماعت کی حیثیت بعینہٖ "امّت" کی سی نہیں۔ بلکہ امّت کے اندر ایک ایسی جماعت کی سی ہے جو فریضۂ اقامتِ دین سے امّت کی عام غفلت کو دیکھ کر اس لیے منظم کی گئی ہے کہ اس فریضے کو ادا کرنے کے لیے خود کوشش کرے' اور بتدریج پوری امّت کو اپنی اس کوشش میں شریک کرے۔ (ترجمان القرآن ج۳۶' عدد۵'۴۔ مطابق ستمبر ۱۹۵۱)

یہ "بتدریج پوری امّت کو اپنی اس کوشش میں شریک" کرنے کا چیلنج ہی آج وقت کے خطرات کا مقابلہ کرنے اور امکانات سے جہانِ نو پیدا کرنے کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس چیلنج کا جواب دیے بغیر کسی تدبیر سے بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

تنظیم ہو یا تربیت' یا پوری امّت کو شریک کرنے کا چیلنج' ہم اپنے اجتہاد سے جو تدابیر اور صورتیں اختیار کرنا چاہیں ان کے ضمن میں ہمیں سیّد مودودیؒ کے پیش کردہ درج ذیل اصول رہنما اصولوں کے طور پر سامنے رکھنا ہوں گے۔

۱- خلافت راشدہ میں جو [تدابیر اور] صورتیں اختیار کی گئیں وہ سب بھی منصوص نہ تھیں' بلکہ چند مباح صورتوں کو حالات و ضروریات کے لحاظ سے اختیار کرلیا گیا تھا۔

ہمارے لیے بالکل جائز ہے کہ اپنے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ہم کچھ دوسری صورت میں دوسری مباح صورتیں اختیار کرلیں۔

۲- کسی [تدبیریا] تجویز کو نہ اس بنا پر رد کردیجیے کہ یہ طریقہ خلافتِ راشدہ میں رائج نہ تھا' اور نہ کسی دوسری تجویز پر صرف اس لیے اصرار کیجیے کہ یہی طریقہ اس زمانہ میں رائج تھا۔ (ترجمان القرآن ج ۳۶' عدد ۵ ' ۶ - مطابق ستمبر ۱۹۵۱)

اگر خلافتِ راشدہ کے دور میں اختیار کردہ تدابیر اور صورتوں کے بارہ میں یہ اصول صحیح ہیں کہ وہ حرفِ قاطع نہیں' اور ان پر صرف اس لیے اصرار صحیح نہیں کہ یہی اُس زمانہ میں رائج تھیں' تو اپنے نظم' تربیت اور وسعت کے بارہ میں ہمارے اپنے ماضی میں اختیارکردہ اجتہادی طریقوں اور تدابیر پر تو ان کا اطلاق بدرجۂ اتم صحیح ہے۔

حسنِ تزئین کے بعد' ماہ جنوری ۱۹۹۴ سے آپ کا یہ رسالہ' ماہنامہ ترجمان القرآن' ہماری بری بھلی کوششوں کے بعد انشاء اللہ آپ تک پہنچے گا۔ حسنِ ظاہری تو ایک حد تک ہمارے اختیار میں ہے۔ صفحات کی تعداد بھی ڈیڑھ گنا سے زائد ہو کر ۸۸ ہو جائے گی' اور کاغذ بھی سفید استعمال ہوگا۔ حسنِ باطنی کے لیے ہم کوشش ہی کرسکتے ہیں۔ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ ہماری کوششوں کو قبول فرمائے اور ہم ایک ایسا پرچہ مرتب کرنے کے قابل ہوں جو آپ کی دینی' علمی' تہذیبی' تربیتی' انفرادی اور اجتماعی ضروریات پوری کرسکے' اور جو مستقبل ملتِ اسلامیہ کے دروازہ پر دستک دے رہا ہے' اس کو حقیقت بنانے میں اپنا حصہ ادا کرسکے۔

اپنی کوششوں کے اصل اجر کے لیے تو ہم اللہ تعالیٰ سے امید رکھتے ہیں۔ لیکن آپ سے یہ درخواست ضرور کریں گے کہ آپ اپنے حلقۂ تعارف میں' اپنے اقربا و احباب میں' اپنے مقام اور حلقۂ ذمہ داری میں بھرپور کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھیں۔ سالانہ خریدار بھی بنائیں' اور ایجنٹ حضرات کو بھی آرڈر دیں' اور نئی نئی ایجنسیاں قائم کرانے کی بھی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے گا۔

گمراہی کے غلبہ میں اہلِ حق کی روش

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظَّالِمِيْنَ ○

اے ہمارے رب، ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا۔

ان صادق الایمان نوجوانوں کی یہ دعا کہ "ہمیں ظالم لوگوں کے لیے فتنہ نہ بنا" بڑے وسیع مفہوم پر حاوی ہے۔

گمراہی کے عام غلبہ و تسلط کی حالت میں جب کچھ لوگ قیامِ حق کے لیے اٹھتے ہیں، تو انہیں مختلف قسم کے ظالموں سے سابقہ پیش آتا ہے۔ ایک طرف باطل کے اصلی علمبردار ہوتے ہیں جو پوری طاقت سے ان داعیانِ حق کو کچل دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف نام نہاد حق پرستوں کا ایک اچھا خاصا گروہ ہوتا ہے جو حق کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے مگر باطل کی قاہرانہ فرماں روائی کے مقابلہ میں اقامتِ حق کی سعی کو غیر واجب، لاحاصل، یا حماقت سمجھتا ہے اور اس کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنی اس خیانت کو جو وہ حق کے ساتھ کر رہا ہے کسی نہ کسی طرح درست ثابت کردے اور ان لوگوں کو الٹا برسرِباطل ثابت کرکے اپنے ضمیر کی اس خلش کو مٹائے جو ان کی دعوتِ اقامتِ دینِ حق سے اس کے دل کی گہرائیوں میں جلی یا خفی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ تیسری طرف عامۃ الناس ہوتے ہیں جو الگ کھڑے تماشا دیکھ رہے ہوتے ہیں اور ان کا ووٹ آخر کار اسی طاقت کے حق میں پڑا کرتا ہے جس کا پلہ بھاری رہے، خواہ وہ طاقت حق ہو یا باطل۔

اس صورتِ حال میں ان داعیانِ حق کی ہر ناکامی، ہر مصیبت، ہر غلطی، ہر کمزوری اور ہر خامی ان مختلف گروہوں کے لیے مختلف طور پر فتنہ بن جاتی ہے۔ وہ کچل ڈالے جائیں یا شکست کھا جائیں تو پہلا گروہ کہتا ہے کہ دیکھ لیا! ہم نہ کہتے تھے کہ ایسی بڑی بڑی طاقتوں سے ٹکرانے کا حاصل چند قیمتی جانوں کی ہلاکت کے سوا کچھ نہ ہوگا اور آخر کار اس تہلکہ میں اپنے آپ کو ڈالنے کا ہمیں شریعت نے مکلف ہی کب کیا تھا، دین کے کم سے کم ضروری مطالبات تو ان عقائد و

اعمال سے پورے ہو ہی رہے تھے جن کی اجازت فراعنۂ وقت نے دے رکھی تھی۔ تیسرا گروہ فیصلہ کر دیتا ہے کہ حق وہی ہے جو غالب رہا۔

اسی طرح اگر وہ اپنی دعوت کے کام میں کوئی غلطی کر جائیں' یا مصائب و مشکلات کی سہار نہ ہونے کی وجہ سے کمزوری دکھا جائیں' یا ان سے' بلکہ ان کے کسی ایک فرد سے بھی کسی اخلاقی عیب کا صدور ہو جائے' تو بہت سے لوگوں کے لیے باطل سے چمٹے رہنے کے ہزار بہانے نکل آتے ہیں اور پھر اس دعوت کی ناکامی کے بعد مدت ہائے دراز تک کسی دوسری دعوتِ حق کے اٹھنے کا امکان باقی نہیں رہتا۔ پس یہ بڑی معنی خیز دعا تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے ان ساتھیوں نے مانگی تھی کہ خدایا ہم پر ایسا فضل فرما کہ ہم ظالموں کے لیے فتنہ بن کر نہ رہ جائیں۔ یعنی ہم کو غلطیوں سے' خامیوں سے' کمزوریوں سے بچا' اور ہماری سعی کو دنیا میں بار آور کر دے' تاکہ ہمارا وجود تیری خلق کے لیے سببِ خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیے وسیلۂ شر۔ (تفہیم القرآن ج دوم' ص ۳۰۶ - ۳۰۷' سورۂ یونس ۱۰: ۸۵)

بقیہ: مسلمان' مسند اقتدار پر

اپنے درے سے اشارہ کیا' درہ اس کے جسم سے چھو گیا اور وہ شخص راستہ سے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اس شخص کو نہ زیادہ تکلیف محسوس ہوئی تھی اور نہ اسے کسی قسم کا احساس تھا لیکن امیرالمومنین کو احساس تھا اور خدا کے محاسبہ کا جو خوف تھا اس نے بے چین کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک مرتبہ اسے بلایا' اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد پوچھا' کیا تم حج کرنے کا ارادہ کر رہے ہو۔ اس نے کہا' امیرالمومنین آرزو تو ہے لیکن میرے پاس اتنی رقم نہیں ہے کہ میں سفر کا سامان کر سکوں۔ حضرت عمرؓ نے ایک رقم نکال کر اس کے حوالے کی اور کہا' جاؤ اس سے زادِراہ تیار کر لو۔ جب وہ کچھ دور جا چکا تو آپ نے پھر آواز دی۔ جب وہ پاس آیا تو آپ نے فرمایا' جانتے ہو یہ رقم میں تمھیں کیوں دے رہا ہوں۔ اس نے کہا' مجھے نہیں معلوم آپ خود ہی بہتر سمجھتے ہوں گے۔ فرمایا' یہ اس درے کا بدلہ ہے جو فلاں موقعہ پر بازار میں تمھارے بدن سے چھو گیا تھا۔ اس نے کہا' مجھے تو یاد نہیں ہے کہ کب یہ واقعہ پیش آیا۔ فرمایا' لیکن مجھے یاد ہے۔

ایمان کیا ہے

مولانا بدر عالم میرٹھی

کامل ایمان

شریعت میں ایمان و اسلام اتباع واطاعت کی اس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد اوامرِ الٰہیہ اور منہیاتِ شرعیہ کے قبول کرنے سے قلب میں کوئی انحراف باقی نہ رہے۔ مخبرِ صادقؐ پر وہ اعتماد حاصل ہو جائے کہ پھر دل کی تمام خوشحالی اور روح کا کامل سرور اس کی تصدیق میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبۂ وفاداری طلبِ دلائل کی مہلت نہ لینے دے۔ راہِ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت ہو' اور ایک ادنیٰ نافرمانی وہ تلخ گھونٹ ہو جائے جو گلے سے اتارے نہ اترے۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ (بقرہ ۲: ۲-۳)

(یہ کتاب) راہ دکھانے والی ہے (اللہ) سے ڈرنے والوں کو' جو یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا۔

ایمان بالغیب کی صفت

اس آیت میں ان ہی سرفروشوں کی اس سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی یہ وہ جماعت ہے جو محض جذبۂ اتباع میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کر چکی ہے۔ آنکھ اگر دیکھتی اور تصدیق کرتی ہے' کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں' تو یہ ان کا فطری اقتضاء ہونا چاہیے۔ لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتیں' کان اگر نہیں سنتے' پھر' ان آنکھوں اور کانوں کے اعتماد پر جن کی صداقت پر سارا جہان قربان' اعتماد کر لیتے ہیں' تو پھر بلاشبہ یہ ان کے ایثار و تابع داری کی آخری دلیل ہو گی۔ یہی وثوق اور اعتماد ایمان کی روح ہے۔

دلائل کی حقیقت

دلائل کی روشنی بھی کوئی روشنی ہے جو ایک قدم پر اگر چمکتی ہے تو دوسرے ہی قدم پر گل ہو جاتی ہے۔ اگر نبی صاحبِ وحی ہے' اور جو کہتا ہے وہ خدائے تعالیٰ کی طرف سے کہتا ہے' تو

اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا ایک اقتضاءِ طبعی ہونا چاہیے۔ کسی حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد بھی دلائل کی تلاش' روشن خیالی نہیں بلکہ ایک مختصر راہ کو اور طویل کر دینا ہے۔ اسی لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں تشریف لانے کے بعد دعوتِ مناظرہ کے بجائے شروع سے عمل کی دعوت دیتے ہیں۔ اگر مدار صرف دلائل پر ہو' تو دلائل کبھی کبھی ہر دو طرف پیدا ہو جاتے ہیں ماسوا اس کے' مطالب کی نزاکت کبھی دلائل کی رسائی سے بالاتر ہوتی ہے۔ پھر مذاق کا تفاوت' سمجھ اور فہم کا اختلاف' اس پر وہمِ انسانی کی مزاحمت' یہ سب وہ موانع ہیں جو' نفسِ تصدیق کے لیے نہ سہی' مگر کم از کم عمل کے لیے تو یقیناً سدِّراہ بن جاتے ہیں۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے صرف اطاعت واتباع ہی کی ایک راہ بتلائی ہے'

مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (الحشر ۵۹:۷)

جو کچھ رسول تمہارے پاس لے کر آئے اس کو اختیار کر لو اور جس سے روکے اس سے رک جاؤ۔

دلائل کا وسیع دائرہ بھی کچھ دور جا کر آخر اسی اتباع پر ختم ہو جاتا ہے۔ ورنہ ایک مقصد کے حصول کے لیے مقدمات کی بے شمار کڑیاں درکار ہوں گی۔ اگر سب کا طے کرنا ضروری ٹھہرے' تو پھر تمام عمر میں ایک مقصد کا حصول بھی خواب و خیال سمجھ لینا چاہیے۔ بہ نظرِ انصاف' ایک تجربہ کار محقق کا قول خود ایسی محکم دلیل ہوتی ہے جو تنہا ہزار دلائل کا وزن اپنے اندر رکھتی ہے۔ آج بھی ہم اپنے دلائل و براہین کا سلسلہ آخر میں یورپ کے فلاسفروں کی تھیوریوں پر جا کر ختم کر دیتے ہیں' اور صرف ان کے اسماء کا حوالہ دے دینا دلائل کی وہ معراج تصور کرتے ہیں جس کے بعد تمام دلائل سے بے نیازی ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں ہوتی کہ وہ تھیوریاں بے دلیل مسلّم ہونے کے قابل ہیں' بلکہ اس کی تہہ میں یہ علمِ یقین پہلے حاصل ہوتا ہے کہ یہ تھیوریاں ان فلاسفروں کے نزدیک چونکہ اپنے دلائل سے ثابت شدہ ہیں' لہٰذا ان دلائل کا تلاش کرنا' اور پھر ان کا دوہرانا' محض ایک مسافت کا طویل کرنا ہو جاتا ہے۔

علومِ نبوی کا مرتبہ

ٹھیک اسی پر علومِ انبیاء کو قیاس کر لینا چاہیے' اگرچہ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ان کے علوم اپنی جگہ بھی ایسے دلائل سے ثابت شدہ ہوتے ہیں جہاں باطل کو کہیں سے راہ نہیں ملتی۔ لیکن وہ علمِ یقین کے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جس کے بعد ان کا لقب برہانِ مجسم ہو جاتا ہے'

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۝ (النساء ۴:۱۷۴)

اے لوگو! پہنچ چکی ہے تمہارے پاس ایک سند تمہارے پروردگار کی طرف سے اور ہم نے تم پر واضح روشنی اتاری۔

کمالِ تفویض و تسلیم

اس لیے انبیاء علیہم السلام کے علوم ان کے اعتماد پر تسلیم کر لینا کورانہ تقلید نہیں' بلکہ مجسم ایک برہان اور حجتِ بینہ کی تقلید ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایمان کی تمام قیمت بندہ کی صرف یہ ادا ہے کہ وہ رسولِ وقت کے سامنے اپنی ساری لن ترانیاں ختم کر دیتا ہے۔ درحقیقت یہ اس کی زبردست قربانی ہے' جسے وہ اپنے ضعیف و ناتواں ہاتھوں سے اپنے رب کی بارگاہ میں پیش کرتا ہے۔ انسان کی بے صبر فطرت اپنی جیسی مخلوق کو ایسے مقام پر کبھی دیکھنا پسند نہیں کرتی' جہاں بے دلیل سرنگوں ہو جانا تمام انسانوں کے لیے وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہو جائے (یعنی رسول)۔ وہ خدائے تعالیٰ کی مخلوق ہے' اور اسی کی اطاعت اپنا فرض تصور کر سکتا ہے۔ اسی لیے مشرکینِ عرب میں بھی تمام جہالتوں کے باوجود ایک جماعت خدا پرست تھی' اور بزعمِ خود توحید کا انکار نہ کرتی تھی۔

اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ يَسْتَكْبِرُوْنَ (الصّٰفّٰت ۳۷:۳۵)

جب کہا جائے ان سے کہ سوائے اللہ کے کوئی (اور) معبود نہیں تو غرور کرنے لگتے ہیں۔

یہاں لفظ یجحدون اسی لیے ارشاد نہیں فرمایا گیا کہ اس دعوت سے انہیں انکار نہ تھا۔ البتہ مسلمانوں کی آواز پر ان کا ہم آہنگ ہو جانا انکے نزدیک اپنی بڑائی کے خلاف تھا۔

آدمؑ کو سجدہ کا حکم

عالم کا سب سے پہلا شقی' یعنی ابلیس' خالق السمٰوٰت والارضین کی عبادت سے کبھی منکر نہیں ہوا۔ لیکن مشیتِ ایزدی نے اس کے دعوائے تابعداری کا جب امتحان لیا تو اپنی عبادت کا امر فرما کر نہیں لیا' بلکہ ایک مشتِ خاک کے سامنے سر جھکانے کا امر فرمایا۔ ظاہر ہے کہ سر جھکا دینا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر ہاں دشواری تھی تو یہ تھی کہ ایک ضعیف ہستی کے سامنے سر جھکانا' جو مخلوق ہونے میں اس کی برابر کی شریک ہو' اس کی آواز فطرت کے برخلاف اور بظاہر ایک بے دلیل بات تھی۔ اس سے رہا نہ گیا اور

اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ (الاعراف ۷:۱۲)

میں بہتر ہوں اس سے۔ (کیونکہ) مجھ کو بنایا ہے تو نے آگ سے اور اس کو بنایا مٹی سے۔

کا نعرہ لگا بیٹھا۔ ولائل کی پیروی کا جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ اس کا پوشیدہ کبر اور طبعی انحراف پھوٹا، اور آخر وہ تسلیم و رضا کی اس منزل میں چل کر ناکام رہ گیا، جہاں خیروشر کا سوال ہی باقی نہیں رہتا اور چون و چرا کا میدان تنگ ہو جاتا ہے۔

فراق و وصل چہ باشد رضائے دوست طلب
کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

(اصل چیز دوست کی خوشنودی ہے، ہجرو فراق کی کچھ اہمیت نہیں۔ بڑے افسوس کی بات ہو گی، اگر دوست سے کسی اور کی خواہش کی جائے)۔

طبعی انحراف وعلو کا خاصہ

طبیعت کے انحراف کا یہ خاصہ ہے کہ وہ تلاشِ حق کی تمام توفیق سلب کر دیتا ہے، اور وہ نشہ پیدا کر دیتا ہے جس کے بعد اپنی ہوائے نفس کے سامنے ولائل و براہین کی کچھ پار نہیں بستی۔ اطراف و جوانب سے آنکھیں بند ہوجاتی ہیں، اور اس بے شعوری کے عالم میں جو فیصلہ اپنے خیال میں آ جاتا ہے وہ آخری فیصلہ نظر آنے لگتا ہے۔ ابلیس نے صرف عنصرِ آتش کے شرف پر نظر کی۔ یہ اس کا قصورِ نظر تھا۔ عنصرِ خاک گو ضعیف ترین عنصر سہی مگر کیا ہو نہیں سکتا تھا کہ اس میں بھی کوئی جہت ایسی پیدا ہوجائے جو اسے قوی و برتر عنصر سے بھی افضل بنا دے۔ اگر ابلیس انسان کی صورت کی طرف بھی نظر کر لیتا تو اپنے مادہ کا شرف اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جاتا۔ عنصرِ آتش ہزار اشرف سہی، مگر یہاں صورت صرف ایک حرف کُن نے عطا کی تھی۔ عنصرِ خاک پر جو نقش ونگار نظر آئے وہ نقاشِ ازل کے خود اپنے دستِ قدرت کا بلاواسطہ کمال تھا۔

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ (ص ۳۸:۷۵)

فرمایا، اے ابلیس تجھے کس چیز نے روکا کہ سجدہ کرتا اس کو جس کو میں نے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا۔ یہ تو نے غرور کیا یا تو درجہ میں بڑا تھا۔

نصبِ خلافت سے پہلے ہی یہ سبق تمام نسلِ انسانی کو دے دیا گیا تھا کہ اسے بھی اپنی اطاعت و انقیاد کا امتحان دینا ہو گا۔ کامیابی صرف اس صورت میں متصور ہو گی جب کہ، خدائے رب العزت کی رضا جوئی میں، اس کے رسولوں کے لیے بھی بے دلیل وہی جذبۂ اطاعت پیدا ہو جائے جو خود اس کے لیے موجزن ہو سکتا ہے۔ اب یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہو گی کہ رسولوں کی باتوں

پر بے دلیل یقین کر لینا کیوں رکنِ ایمان قرار دیا گیا ہے۔

کمالِ محبت' محبوب کی رضا میں فنا

حدیث شریف میں انصار کی محبت کو علاماتِ ایمان میں شمار کیا ہے۔ رسول اور اس کے کنبہ وقبیلہ یا ہم وطن کی محبت تو ہر مسلمان میں طبعی طور پر بھی ہو سکتی ہے' اور ہونی بھی چاہیے۔ مگر انصار کی محبت' جو نہ اس کا ہم قبیلہ تھے نہ ہم وطن' اگر ہو سکتی ہے تو صرف اس لیے کہ انھوں نے رسول کی ایسے آڑے وقت اعانت کی تھی جب کہ اس کے قبیلہ تک نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور بلاشبہ یہ محبت کمالِ ایمان ہی کا ثمرہ ہو سکتی ہے۔ محبوب تو نظرِ عاشق میں سر تا سر محبوب ہوتا ہے۔ مگر اس میں کمال کیا ہے کہ اس کی ہر ہر ادا عشاق کی دلربائی کا مستقل ایک ایک افسوں ہوتا ہے' کمالِ محبت تو یہ ہے کہ اس کی رضا میں وہ فنا میسر ہو جائے کہ پھر یگانہ و بیگانہ' مکروہ و محبوب کا امتیاز جاتا رہے۔ بلکہ تمام محبت و شفقت' ہمدردی وسلوک' تعاون و سازگاری کا وہی ایک محور و مرکز بن جائے۔ مال و اولاد کا تو ذکر کیا ہے' اپنے نفس سے اگر محبت رہ جائے تو وہ بھی اسی کی خاطر ہو۔ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۔

اس کی راہ میں تمام قربانیاں شیریں بن جائیں۔ اس کے خلاف میں ساری خوشحالیاں کانٹے نظر آئیں۔ اس کے نام پر گردنیں اتروا دینا حیوٰۃِ ابدی معلوم ہو۔ اپنی قربان گاہ سے ایک قدم پیچھے ہٹانا موتِ ابدی نظر آئے۔ اور یہ سب کچھ اس تصور میں ہو کہ یہ ساری جاں نثاریاں گو اس قابل نہ سہی کہ محبوب کے لیے قابلِ نظر ہوں' مگر ایک عاشق کی یہ حسرت ہونا چاہیے کہ راہِ عشق میں جو قربانی وہ کر سکتا ہے کر گزرے۔ حضرت بلالؓ و عمارؓ کے سرفروشانہ جذبات پر سیرت نگاروں کو حیرت ہے۔ مگر خود ان کی زبانی دریافت کیا جاتا تو ساقیٔ کوثر کے ہاتھ سے ان جام پینے والوں سے شاید انھیں شکایت ہوتی جنھیں اس کے ہاتھ سے جام پی کر تکلیف و راحت کا احساس باقی تھا۔

ازاں افیوں کہ ساقی کردہ بدمست
رفیقاں را نہ سر ماند نہ دستار

(ساقی نے جس چیز سے بدمست کر رکھا ہے' اس سے دوستوں کو کسی چیز کا ہوش نہیں ہے)۔

ایمان میں اسی منزل کا نام مقامِ یقین ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی جب نشۂ یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس سے اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالمِ غیب پر انکو محسوسات کی طرح یقین ہو جاتا ہے' فقر و غنا' حیوٰۃ و موت کے خرخشہ سے انسان بے

نیاز ہو جاتا ہے' اسباب کے قید و بند سے رستگاری میسر آ جاتی ہے۔

مذہب کی روح اور بنیاد

یہ ہے وہ ایمان جس پر مذہب کی تمام بنیاد قائم ہے۔ کوئی عقیدہ اپنے دامن میں خواہ کتنی ہی نزاہت اور رفعتیں کیوں نہ رکھتا ہو' مگر اس نورِ ایمانی کے بغیر نظرِ شریعت میں وہ صرف ایک ظلمت کدہ اور سرتاسر تاریکی ہے۔ کوئی عمل' مجاہدات و ریاضت کے خواہ کتنے ہی مراحل کیوں نہ طے کر چکا ہو' مگر بدون اس روحِ ایمانی کے ایک تنِ مردہ اور میزانِ آخرت میں قطعاً بے وزن ہے'

فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا (الکھف ۱۸:۱۰۵)

پس ہم ان کے لیے قیامت کے دن کوئی تول قائم نہ کریں گے۔

عقائد و اعمال کا تو ذکر کیا ہے' کوئی معمولی سی معمولی سیت بھی' خواہ کتنی ہی صاف و ستھری کیوں نہ ہو' اس سرمایۂ ایمان کے بغیر بارگاہِ بے نیاز میں کوئی اعتبار نہیں رکھتی۔ یہ ایمان' عقائد واعمال اور نیتوں کی وہ واحد روح ہے جس کے بعد کفر کی توبرتو تاریکیاں چشمِ زدن میں کافور ہو سکتی ہیں۔ آتش کدۂ جہنم اس کے روبرو سرد ہو سکتا ہے' اور گلزارِ عدن اس کا ایک طے شدہ معاوضہ بن جاتا ہے۔ ایک معمولی سجدہ طاعاتِ صد سالہ کے لیے مایۂ رشک اور مٹھی بھر جو کا صدقہ بے شمار تضاعیف (زیادتیاں) کا مستحق نظر آنے لگتا ہے۔ غرض سعادتِ ابدیہ اسی مبداء کی خبر ہے' اور شقاوتِ ازلیہ اس سے محرومی کا نشان ہے۔ یہ سب کچھ اس سچی کتاب میں موعود ہے جو غلط گوئی سے بالکل منزہ اور مبالغہ آمیزی سے یکسر مبرا ہے۔

ہادم اللذّات

کمزور حافظہ کی ایک تاریخی مثال

مولانا سیّد مناظر احسن گیلانیؒ

خلاصہ یہ ہے کہ سب کچھ یاد رکھتے ہوئے، زیاد نے خدا ہی کو بھلا دینا چاہا، اور اس کو بھلا دیا تھا۔ ایسی صورت میں کیوں تعجب کیجیے، اگر اس کے حافظہ سے اپنی ماں سمیّہ، اپنے باپ عبید، اور اپنے سب سے بڑے محسن و ولی نعمت سیدنا علیؓ کی یاد نکل گئی، آخر

نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ (الحشر ۵۹: ۱۹)

انہوں نے بھلا دیا اللہ کو، بس اللہ نے بھی فراموش کرا دیا، ان کو خود اپنے آپ سے۔

یہ تو قرآن ہی کا قدرتی قانون ہے۔ خدا کو بھول جانے کے بعد زیاد درحقیقت خود اپنے آپ کو بھول گیا تھا۔ اس لیے نہ ماں ہی اس کو اپنی یاد رہی اور نہ باپ، اور نہ ان بزرگوں کو وہ یاد رکھ سکا جن کی تربیت و تعلیم نے باندی کے اس بچے کو ایران و خراسان کی گورنری کے لائق بنا دیا تھا۔

اپنے آپ کو فراموش کیے ہوئے اس انسان میں برسرِ حکومت آنے کے بعد شاید یہ وہم پیدا ہوا کہ "گورنر" ہونے کے سوا نہ پہلے وہ "اور کچھ" تھا اور نہ آئندہ اسے "اور کچھ" ہونا ہے۔ گورنری کو اسی لیے شاید وہ اپنا پیدائشی حق یقین کرنے لگا۔ اسی لیے زمین کا وہ طویل و عریض علاقہ جو کمشنری ایران کے مقبوضہ سے بھی بڑا اور کافی بڑا تھا، ان خطوں کی حکومت بھی اس کو ناکافی نظر آنے لگی۔ آگے قدم بڑھانے کے لیے حجاز اور عرب کی عام حکومت کی درخواست اس نے پیش کر دی۔ اور مقصد میں کامیاب ہونے کے لیے "اجتماعِ عام" کا حکم کوفہ والوں کو اس لیے دیا کہ حضرت علیؓ سے تبرّا کا اقرار ان سے لے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب سب کچھ وہ اپنے آپ ہی کو تصور کر رہا تھا، اور جس نے پیدا کرکے اس قابل اس کو بنایا تھا، اس کی ذمہ داریوں سے اپنی

آنکھیں میچے ہوئے تھا۔

لیکن ظاہر ہے کہ بندر لاکھ اپنی آنکھیں بند کر لے' پھن کھولے ہوئے سانپ کا وجود تو اس کی آنکھیں بند کرنے سے معدوم نہیں ہو سکتا۔ جس خدا سے زیاد نے اپنے آپ کو غافل بنا لیا تھا' وہ اچانک اس کے سامنے آ گیا۔

مورخین نے لکھا ہے کہ حجاز کے شہروں' مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں یہ خبر پہنچی کہ زیاد نے وہاں کی حکومت کی خواہش امیر معاویہؓ سے کی ہے' تو لوگوں میں کافی بے چینی اور سراسیمگی پھیل گئی۔ عمر فاروقؓ کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے چند لوگوں کو جمع کیا۔ خود دعا کرتے جاتے تھے کہ اے پروردگار' زیاد کی مصیبت میں ہم لوگوں کو مت مبتلا فرما' اور دوسرے آمین کہتے تھے۔ (کامل ابنِ اثیر' ص ۱۱۱' ج ۴)

مدینہ منورہ میں تو یہ ہو رہا تھا۔ ادھر کوفہ میں' جہاں اجتماعِ عام کا حکم زیاد نے دیا تھا' کوفہ کا ہر قابلِ ذکر آدمی زیاد کی ڈیوڑھی کے سامنے انتہائی حیرانی اور پریشانی کے ساتھ کھڑا تھا۔ دارالامارہ سے لوگوں کو خطاب کرنے کے لیے زیاد ابھی باہر نہیں نکلا تھا۔ ایک صاحب' جن کا نام عبدالرحمٰن بن سائب تھا اور اسی مجمع میں وہ بھی شریک تھے' کہتے ہیں کہ اچانک مجھ پر غنودگی کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ بیٹھے بیٹھے غنودگی کے اسی حال میں کیا دیکھتا ہوں کہ

> بڑی لمبی چوڑی گردن اونٹ کی گردن کے مانند میرے سامنے نمایاں ہوئی' جس کے ہونٹ لٹکے ہوں اور پپوٹے بھی جس کے پھولے پھولے ہوں۔

عبدالرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا تو کون ہے؟ جواب میں میں نے سنا' وہ لمبی گردن بول رہی ہے:

> میں چن لینے والے کا باپ' گردن والا ہوں۔ اسی قصر (دارالامارہ) والے کے لیے اٹھایا گیا ہوں۔

اسی کے بعد غنودگی کی کیفیت کا ازالہ ہو گیا۔ اردگرد ان کے جو لوگ تھے' ان سے عبدالرحمٰن پوچھنے لگے' آپ لوگوں نے بھی کچھ دیکھا۔ بولے' نہیں ہمیں تو کچھ نظر نہ آیا۔ تب میں نے جو کچھ دیکھا تھا اس کا حال ان لوگوں سے بیان کرنے لگا۔ بیان کر ہی رہا تھا کہ اچانک قصر سے ایک شخص برآمد ہوا اور اعلان کیا:

> امیر (یعنی زیاد) کا حکم ہے کہ آپ لوگ چلے جائیں' کیوں کہ میرے ساتھ ایک قصہ

پیش آگیا ہے۔

آلام و مصائب کا سیاہ بادل تھا جو چھانے کے بعد اچانک اس اعلان کے ساتھ ہی چھٹ گیا' لوگ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ ابھی مجمع رخصت بھی نہیں ہوا تھا کہ گورنر ہاؤس سے یہ خبر مجمع تک پہنچی کہ زیاد پر طاعون یا فالج کا حملہ ہو گیا ہے۔

زیاد اب صاحبِ فراش تھا۔ تکلیف سخت اور بہت سخت تھی۔ کہتے ہیں کہ جس مقام پر طاعون کی گلٹی یا پھوڑا نمایاں ہوا تھا' زیاد بار بار چاہتا تھا کہ بدن کے اس حصہ کو کٹوا دے۔ آپریشن کرنے والے اس حکم کے مطابق چیرپھاڑ کے آلات اور کاٹنے کے بعد داغنے کے سامان کو لے کر آ بھی گئے۔ لیکن ان لوگوں کی خاص شکل و صورت اور انکے مہیب آلات کو دیکھ کر زیاد پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ ان کو اس نے واپس کر دیا۔ پلنگ پر تلملا تلملا کر کروٹیں بدلتا تھا اور کہتا "میں اور طاعون کا یہ پھوڑا' دونوں ایک لحاف کے اندر رات کیسے بسر کر سکیں گے۔"

کراہ کراہ کر ساری رات گزاری۔ صبح جس وقت ہوئی' تو حالات اتنے ابتر ہو چکے تھے کہ پانی کا ایک گھونٹ بھی حلق کے نیچے اتارنا فرہاد کے جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ دشوار ہو چکا تھا۔ پانی منہ میں ڈالتا تھا' لیکن اسے نگل نہیں سکتا تھا۔ کوفہ کے گورنر ہاؤس میں ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ لوگ آ رہے تھے' جا رہے تھے۔

اطباء اپنی تدبیروں میں مشغول تھے کہ اچانک ایک شور برپا ہوا' معلوم ہوا کہ دمشق سے شاہی فرمان لے کر لوگ آئے ہیں۔ ہیثم نامی برید کا سرگروہ تھا۔ زیاد نے حجاز' نجد' یمامہ عرب کے علاقوں کی گورنری کی جس آرزو کو حکومت میں پیش کیا تھا' اس کی منظوری کا فرمان دربارِ خلافت سے صادر ہوا تھا۔ زیاد دردوکرب کی شدت سے تڑپ رہا تھا کہ سرہانے پہنچ کر یہ مژدہ اس کے کانوں تک پہنچانے والے نے پہنچایا: "گورنر ہاؤس" کے دروازے پر ہیثم کھڑا ہے' اس کے ساتھ وہ فرمانِ شاہی ہے جس میں حجاز پر تمہاری گورنری کی منظوری صادر ہوئی ہے۔"

خدا ہی جانتا ہے کہ زیاد اپنے دل میں حجاز کی حکومت کی تمنا کو کب سے پال رہا تھا۔ وہی حجاز جس میں دوسرے مقامات کے ساتھ طائف کا وہ شہر بھی تھا جہاں سمیّہ باندی کے پیٹ سے وہ رومی غلام عبید کے گھر پیدا ہوا تھا۔ لیکن زندگی کی یہی سب سے بڑی آرزو جب واقعہ بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوئی تو سنا گیا کہ زیاد کہہ رہا تھا:

دور ہو جاؤ' ہیثم! اور اپنے ساتھ ہیثم جو کچھ لایا ہے اب وہ میرے کس کام کا! خدا کی قسم پانی کا ایک گھونٹ جو فرو ہو جائے' میرے لیے' ہیثم اور ہیثم اپنے ساتھ جو کچھ لایا

ہے' اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے۔ (ابنِ عساکر' ص ۴۲۲' ج ۵)

اور اب اپنی بھلائی ہوئی حقیقت کی یاد نکلنے کے بعد اس کے حافظہ میں واپس آئی۔ اس کے سامنے اب نہ ایران تھا نہ خراسان' نہ عراق تھا نہ سندھ' نہ بحرین اور نہ عمان۔ جو کچھ بھی تھا اس کا اندازہ اس وصیت نامہ سے ہوتا ہے' جسے ابنِ عساکر ہی نے حضرت امام شافعیؒ کے حوالے سے اپنی کتاب تاریخِ دمشق میں نقل کیا ہے۔ وصیت نامہ کا ترجمہ یہ ہے:

اللہ کا حکم جو سامنے آ چکا ہے اسی کا انتظار کرتے ہوئے' یہ وصیت نامہ لکھوا رہا ہوں۔ حق سبحانہ و تعالیٰ کی قدرت میرے لیے ناقابلِ انکار بن چکی ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ (معبود) نہیں ہے' وہی تنہا ہے' اس کا کوئی شریک اور ساجھی نہیں ہے۔ یہ گواہی اس شخص کی ہے جو اپنے مالک کو جانتا اور پہچانتا ہے' اور اپنے حساب و کتاب کا ڈر جس پر مسلط ہے۔ میں اس کی بھی شہادت ادا کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اللہ کے رسول' پیغام پہنچانے والے ہیں۔ میں مسلمانوں کے امیر اور خلیفہ کو بھی' اور عام مسلمانوں کو وصیت کرتا ہوں کہ خدا سے ڈرتے رہیں۔ اور نہ مرے ان میں کوئی مگر اپنے آپ کو مسلمان بنائے ہوئے۔ چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک بڑی اور چھوٹی باتوں کا خیال رکھے۔

پھر اپنی زندگی اور جن حالات سے وہ گزرا تھا' ان ہی سے عبرت حاصل کرنے کے لیے اسی وصیت نامہ میں یہ بھی لکھوایا:

اللہ کی نعمتیں جن لوگوں کے لیے پوری کی گئی ہوں' ان کو چاہیے کہ دنیا کو اسی جگہ پر رکھیں جو اس کا واقعی مقام ہے۔ یعنی جن لوگوں کے حقوق انکے ذمہ عائد ہوئے ہوں' ان کو ادا کریں اور بڑے بننے کا خیال دل سے نکال دیا جائے' کہ دنیا میں بڑے بننے کی گنجائش ہی نہیں رکھی گئی ہے۔ کیونکہ دنیا ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے' ایک راستہ ہے جس سے آدمی گزر جاتا ہے۔ بہرحال اس راستہ سے گزرنے کے بعد خدا کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ بس اسی خدا سے میں لوگوں کو چونکاتا اور ڈراتا ہوں' اور میں وصیت کرتا ہوں کہ اس گھر میں داخل ہونے سے پہلے جس سے واپسی ناممکن ہے' اور واپسی کے دروازے جس گھر میں پہنچنے کے بعد بند ہو جاتے ہیں' لوگو! ان نیکیوں کے حاصل کرنے میں جلدی کرو' جن سے محروم ہونے والے محروم ہو ہو کر جا رہے ہیں۔

زیاد پر جزع فزع کی حالت طاری تھی اس کا مشہور بیٹا جسے فاجعہ کربلا کے کرتوتوں نے

رسوائے زمانہ بنا رکھا ہے' وہی ابنِ زیاد باپ کی بالیں پر کھڑا کہہ رہا تھا: "اباجان! آپ گھبرایئے نہیں' میں نے آپ کے کفن کے لیے ساٹھ تھان کپڑوں کے پہلے سے فراہم کر کے رکھ لیے ہیں۔"

مطلب اس بدبخت ابنِ زیاد کا شاید یہ تھا کہ آپ کا جنازہ بڑے دھوم دھام سے نکالوں گا۔ چند گزوں کی جگہ جس مرنے والے کے لیے ساٹھ ساٹھ تھان کا انتظام صرف کفن دینے کے واسطے تیار رکھا گیا ہو۔ اس کے لیے اور کیا کیا نہ کیا جائے گا۔ لیکن باپ ابنِ زیاد نہیں زیاد تھا۔ بڑے بڑوں کی صحبت اس کو میسر آئی تھی' گو اس صحبت سے فائدہ اٹھانے کا موقع جیسا کہ چاہیے اس کو نہ ملا تھا۔ تاہم بیٹے کی طرح باپ اتنا احمق نہ تھا۔ لکھا ہے کہ جھنجلا کر ابنِ زیاد کو زیاد نے جواب دیا:

> میرے بیٹے! تیرے باپ کے سر پر وہ گھڑی آ کر کھڑی ہو گئی ہے' جس کے بعد نہیں کہا جا سکتا کہ جو لباس اس وقت اس کے بدن پر ہے اس سے بہتر لباس سے وہ نوازا جائے گا' یا یہ بھی جو کچھ ہے وہ بھی جلد ہی چھن جائے گا۔ (طبری' ص ۱۴۶' ج ۵)

کسی کو زیاد کے اس حال پر رحم آگیا' اور جیسا کہ دستور ہے' تسلی دیتے ہوئے اس نے کہا کہ آپ مایوس نہ ہوں' میں آپ کو بشارت دیتا ہوں۔ بیان کیا گیا ہے' اس وقت اس کے کمزور حافظہ میں اپنی گزری ہوئی ناکردنیوں کی یاد ایک ایک کر کے جاگ رہی تھی۔ خدا ہی جانتا ہے ناحق کتنوں پر اس نے زندگی تنگ کی تھی' اس کی گردن پر کتنے ناحق خونوں کا وبال لپٹا ہوا تھا۔ خصوصاً کوفہ کے ایک بزرگ جن کا نام ابوالمغیرہ (۱) تھا' اس نے بلاوجہ صرف اس لیے ان کو قتل کرا دیا تھا کہ عوام پر ان کا اثر ہے (۲)۔ لوگ ان کے تقویٰ' زہد و عبادت کے معترف تھے۔ یہ فعل زیاد سے اس وقت صادر ہوا تھا جب "الامیر" یا "گورنر" ہونے کے سوا اس کے حافظہ میں کسی چیز کی یاد بیدار نہ تھی۔ مگر اس وقت وہی باتیں جو اس کے دماغ میں دفن ہوتی چلی گئی تھیں' آنکھیں مل مل کر سامنے آ آ کر کھڑی ہو رہی تھیں۔ ان ہی میں ابوالمغیرہ کا کٹا ہوا سر بھی تھا۔ اور لہو میں ڈوبا ہوا وہ جسد بھی جو تڑپ تڑپ کر اس کے سامنے ٹھنڈا ہوا تھا۔ لکھنے والے نے لکھا ہے کہ بشارت کی جھوٹی طفل تسلی کو سن کر زیاد کی زبان پر بے ساختہ یہ فقرہ جاری ہوا:

> بشارت کیسے؟ راستہ پر دیکھو! ابوالمغیرہ کھڑے ہوئے ہیں۔ (ابنِ عساکر' ص ۴۲۲)

دیکھا گیا کہ یہی بولتے ہوئے' بولنے والا چپ ہو گیا۔ اور ایسا چپ ہوا کہ پھر کسی نے اس کی کوئی بولی نہ سنی۔ تو یہ تاہی کوفہ کے قبرستان میں زیاد کی لاش مٹی کے نیچے دبا دی گئی۔ بجلی کی

طرح زیاد کی موت کی خبر ملک کے اطراف و جوانب میں پھیل گئی۔ کہتے ہیں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ ان کی دعا قبول ہو گئی اور حجاز کا گورنر ہونے سے پہلے زیاد مر گیا' تو فرمایا

سمیّہ کے بیٹے! لے' نہ دنیا ہی تیرے لیے باقی رہی' اور نہ آخرت ہی کی (راحت کو) تو پا سکا۔

ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فقرے کے یہ الفاظ --- "**لا الد نیا بقیت لک ولا الاٰخرۃ ادر کت**" ' "نہ تیرے پاس دنیا باقی رہی اور نہ ہی تجھے آخرت ملی" --- سیاسی کاروبار میں زندگی گزارنے والوں کے لیے غور کیا جائے تو ایک عبرت آموز تاریخی سبق ہیں۔ خود یہی زیاد کوفہ کے گورنر ہاؤس میں بیٹھا کرتا تھا کہ ایک بلی آئی اور کسی گوشہ میں بیٹھ کر چوہے کا انتظار کرنے لگی۔ دن ختم ہو گیا' آفتاب غروب ہو رہا تھا کہ کہیں سے کوئی بدبخت چوہا نکل پڑا۔ بلی نے اسے دبوچ لیا۔ ایک صاحب جو زیاد کے ساتھ دیر تک اس تماشے کو دیکھ رہے تھے' وہی کہتے تھے کہ' میری طرف مخاطب ہو کر زیاد نے کہا: "اس بلی سے ان لوگوں کو سبق سیکھنا چاہیے کہ جو کسی مہم کو سر کرنا چاہتے ہیں۔"

مطلب یہی تھا کہ غروب ہی کے وقت سہی' لیکن بلی بالآخر کامیاب ہو کر رہی۔ دراصل یہ خود زیاد کی زندگی تھی۔ طبقات ابنِ سعد کی روایت کے مطابق' "جس سال مکہ فتح ہوا' زیاد طائف میں پیدا ہوا' کوفہ میں ۵۳ھ میں اس وقت مر گیا جب کوفہ کا گورنر امیر معاویہ کی طرف سے تھا۔" (ص ۷۱' ج ۷' حصہ اوّل)

گویا زیاد کی عمر بہ مشکل ۴۵ سال ثابت ہوتی ہے۔ یا اسی روایت کو مان لیا جائے کہ ہجرت کے سال وہ پیدا ہوا تو زیادہ سے زیادہ ۵۲ سال تک ہی جینے کا موقع ماننا پڑے گا کہ اس کو ملا' مگر کوفہ اور بصرہ کی گورنری کی مدت' اس کی پوری عمر خواہ ۴۵ یا ۵۲ ہو' لے دے کر کل ۵ سال ہے۔ طبری نے زیاد کے غلام فیل کے حوالے سے یہ روایت نقل کی ہے کہ "عراق پر زیاد نے کل پانچ سال حکومت کی۔"

اس پانچ سال میں بھی زیاد جیسے سیاسی بازی گر کو' جو صحیح نتائج تک پہنچنے کے لیے اس کی قطعاً پرواہ نہ کرتا تھا کہ جن ذرائع کو اختیار کر رہا ہے وہ صحیح ہیں یا غلط' جوڑ توڑ کے سلسلہ میں جن الجھنوں میں الجھنا پڑا ہو گا اس کا اندازہ وہی کر سکتے ہیں' جو اس قسم کی غلط سیاسی زندگی کے طوفانوں میں خود کو ڈال کر ان ہی تجربات میں سے گزر رہے ہیں' جن سے زیاد گزرا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ

ان غریبوں کو چین اور سکھ' آسودگی' اور طمانیت کے چند لمحات بھی اپنی ساری جاہی بلندیوں کے باوجود نصیب ہوجائیں' تو غنیمت ہے۔ دوسروں کو ان غریبوں کی زندگی خواہ جس حد تک قابلِ رشک نظر آتی ہو' لیکن خود ان کو اپنے آپ میں واپس ہونے کا موقعہ کبھی جب مل جاتا ہے' اگرچہ یہ موقعہ بھی ان کو بہت کم نصیب ہوتا ہے' تو ہر دوسرے کی زندگی ان ہی کے لیے باعث غبطہ و رشک بن جاتی ہے۔

دنیا یوں ہاتھوں میں آنے کے بعد ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور دنیا کے بعد زندگی کی جو منزلیں ان کے سامنے آتی ہیں' ان میں اپنی ٹیڑھی زندگی کے نتائج و انجام کو ظاہر ہے سیدھی شکلوں میں کیسے پا سکتے ہیں' گویا سیاسی پیشہ وروں ہی کے متعلق طبلہ کی تھاپ میں سننے والوں کو شاید یہ سنایا گیا تھا کہ

در پے دنیا' دیں ہم رفت' آں ہم رفت و ایں ہم رفت
(دنیا کے درپے ہوا' دین ہی ہاتھ سے گیا' وہ بھی گئی' یہ بھی گیا)

---

(۱) ابن عساکر کا بیان ہے کہ کوفہ کا امیر ہونے کے بعد زیاد پہلی دفعہ جب پہنچا' اور دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ کوفہ والوں میں سب سے زیادہ عبادت گزار ابوالمغیرہ سمجھے جاتے ہیں۔ اسی وقت ان کو طلب کر کے اس نے حکم دیا کہ میں کافی مالی معاوضہ آپ کو دوں گا۔ آپ گھر کے باہر نکلنا چھوڑ دیں۔ ابوالمغیرہ نے کہا' سبحان اللہ مسلمان آدمی یہ کیسے کر سکتا ہے۔ کچھ نہیں تو نماز ہی کے لیے گھر سے نکلنے پر مجبور ہے۔ ماسوا اس کے مسلمانوں کی عیادت' ان سے ملنے جلنے کے لیے باہر نکلنا میرا دینی فریضہ ہے' ساری دنیا بھی مجھے مل جائے جب بھی ان دینی امور سے دست بردار ہونے کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔ زیاد نے کہا خیر' ان باتوں سے میں منع نہیں کرتا' لیکن پبلک سے کوئی تعلق نہ رکھو' جواب میں ابوالمغیرہ نے کہا کہ مسلمانوں کو بری بھلی باتوں سے آگاہ نہ کروں' یہ بھی مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ زیاد نے کہا کہ ابومغیرہ تو پھر تمہاری پناہ گاہ اب صرف تلوار ہے' بولے تلوار' اس سے مجھ کو کب انکار ہے' بدبخت نے حکم دیا اور بے چارے ابومغیرہ کی گردن اڑا دی گئی۔ اور یہ تو ایک چیز کی مثل ہے' عرض کر ہی چکا ہوں کہ حجاج کے مقتولوں کی تعداد خواہ زیادہ ہو لیکن مسلمانوں کے قتل کرنے میں زیاد جتنی لاپرواہیوں سے کام لیتا تھا حجاج اتنا غیر محتاط نہ تھا۔

(۲) ابومغیرہ کو دیکھ کر زیاد نے کہا تھا "اگر یہ بدکا تو سارا کوفہ اس کے ساتھ بدک جائے گا۔"

مسلمان، مسندِ اقتدار پر

مولانا عبدالسّلام قدوائی

اسلام نے زندگی کے سارے نظام کو بدل دیا تھا، جس طرح اس نے دنیا کے سارے شعبوں میں تبدیلی پیدا کر دی تھی، اسی طرح اس نے حکومت کا تصور بھی بالکل بدل دیا تھا۔ اسلام سے پہلے حکومت کا مقصد عیش پسندی، تن پروری، ملک گیری تھا، لیکن اسلام نے دنیا کو بتایا کہ حکومت دراصل مخلوقِ خدا کی خدمت کا نام ہے، اس نے قوم کے سردار کو قوم کا خادم بنایا اور نہ صرف قول سے، اس خدمت گرانہ نظامِ حکمرانی کو لوگوں کے دلوں میں جمایا بلکہ اس کے ایسے واضح اور نمایاں نمونے پیش کیے، جو ہمیشہ تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھے جائیں گے اور ظلم وستم کے مارے ہوئے انسانوں اور آفات وحوادثِ روزگار کے ستائے ہونے بندوں کے لیے اطمینان اور تسکین کا باعث رہیں گے، اس وقت تمام واقعات کا استقصاء مقصود نہیں ہے اور نہ ان چند اوراق میں یہ ممکن ہی ہے۔ صرف تاریخِ اسلام کے چند منتشر واقعات بر سبیلِ تذکرہ پیشِ خدمت ہیں، شاید اس دفترِ پارینہ کی بازخوانی داغ ہائے سینہ کی تازگی کا باعث ہو، اور زندگی کے اس اندھیرے میں شاید کچھ کرنیں راہ نمائی کا باعث ہو سکیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت ہے۔ حکومت کی ذمہ داریاں سنگین ہیں۔ ایک طرف آنحضرتؐ کی وفات سے وحیٔ الٰہی کا سلسلہ منقطع ہو چکا ہے، اور زمین والے آسمانی رہنمائی سے محروم ہو چکے ہیں۔ دوسری طرف اندرونِ عرب میں ارتداد کا ہنگامہ بپا ہے۔ مخالفت کا زور ہے۔ مالیہ (زکوٰۃ وغیرہ) کی ادائیگی سے انکار ہے۔ تیسری طرف رومی اور ایرانی شہنشاہ، عرب کو پامال کرنے کے منصوبے باندھ رہے ہیں۔

لیکن اس وقت بھی حکومت و جہانبانی کی ذمہ داریوں کے ساتھ ساتھ مخلوق کی خدمت کی دھن ہے۔ حد یہ ہے کہ اس بارے میں بچوں تک کی دل شکنی گوارا نہیں ہے۔ خلافت سے پہلے

کسی بڑھی عورت کی بکری کا دودھ دوھیا کرتے تھے۔ خلافت کے بعد اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ اس کی چھوٹی بچی کھیلتی ہوئی باہر ملتی ہے' اور ہنستے ہوئے کہتی ہے' یہ اب خلیفہ ہو گئے ہیں' اب یہ ہماری بکری نہیں دوہیں گے۔ حضرت صدیقؓ فرماتے ہیں' نہیں نہیں' میں اب بھی تمہاری بکری دوہوں گا۔ پھر اس کہنے پر اس پابندی سے عمل کرتے ہیں کہ اپنے پورے دورِ خلافت میں اس کی بکریاں دوہتے رہتے ہیں۔

خدمت کے اس شدید جذبہ کے ساتھ بے نفسی اور بے غرضی کا یہ عالم ہے کہ گزر اوقات کے لیے تنخواہ لینا بھی گوارا نہیں۔ خلافت کے بعد لوگ دیکھتے ہیں کہ پیٹھ پر کپڑوں کا پشتارہ لدا ہے اور بازار سے گزر رہے ہیں۔ یہی تجارت ان کا ذریعہ معاش تھی۔ لیکن جب کہ خلافت کی ذمہ داریاں بڑھیں تو لوگوں نے اصرار کیا کہ اب اس ذاتی کاروبار کی گنجائش نہیں۔ اس میں مشغولیت رعایا کی دیکھ بھال سے ایسا نہ ہو کہ غافل کر دے۔ بالآخر پبلک مفاد کی خاطر گزر اوقات کے لیے معمولی سی رقم قبول کرنی پڑی۔ لیکن انتقال کے وقت اس کا خیال آیا تو طبیعت بے چین ہو گئی۔ وصیت کی کہ ان کی ذاتی جائیداد فروخت کر کے یہ رقم بیت المال کو واپس کر دی جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپؓ کے بعد حضرت عمرؓ کے سامنے جب یہ بات آئی تو وہ آب دیدہ ہو گئے' اور روتے ہوئے فرمایا' خدا رحم کرے' ابوبکرؓ اپنے بعد والوں کے لیے معاملہ بڑا سخت کر گئے۔

فاروقِ اعظمؓ پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کے اس عمل کا زندگی بھر اثر رہا۔ وہ بھی بہت ہی معمولی طریقہ سے زندگی بسر کرتے تھے۔ نہ کھانے میں لذت کی فکر تھی' نہ پوشش میں زینت کا خیال تھا۔ موٹا جھوٹا کھا کر' پھٹا پرانا پہن کر یہ زندگی کے دن گزار دینا چاہتے تھے۔ لوگوں نے بارہا نصیحت کی' ہمدردوں نے طرح طرح سے سمجھایا' کہ اپنی جان پر رحم کریں۔ لیکن آپؓ نے یہ کہہ کر لوگوں کو لاجواب کر دیا کہ میں اپنے دونوں پیشرو محبوب بزرگوں کے نقشِ قدم پر چل کر زندگی کی یہ منزل طے کرنا چاہتا ہوں تاکہ جب یہ سفر ختم ہو تو انہی کے ساتھ قیام نصیب ہو۔ بیت المال سے جو معمولی رقم اپنی ضروریات کے لیے لیتے تھے' آخر وقت میں اپنے اہلِ خاندان کو وصیت کی کہ یہ رقم بیت المال کو واپس کر دی جائے۔

اس بے نیازی اور بے غرضی کے باوجود خدمت کا جذبہ غیر معمولی تھا' ایسا غیر معمولی کہ دنیا کی قوموں کی تاریخ میں اس کی نظیر ملنا ناممکن ہے۔ خیال تو کیجیے کہ دن بھر حکومت کی اہم ذمہ داریاں انجام دی جاتی تھیں' اور راتوں کو جب انسان کیا جانور تک محوِ خواب ہوتے تھے' فاروقِ اعظمؓ مدینہ کی گلیوں میں پھرتے ہوتے تھے تاکہ اندازہ لگائیں کہ لوگ کس حال میں ہیں' انہیں

کیا مشکلات ہیں، وہ کس تکلیف میں مبتلا ہیں اور ان کی پریشانیوں کا کیا عالم ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے، وہ جاگتے تھے تاکہ دوسرے آرام کی نیند سوئیں، وہ پریشانی اٹھاتے تھے تاکہ دوسرے آرام اٹھائیں۔

ایک دن رات کو حسبِ معمول گشت کے لیے نکلے تو دیکھا کہ شہر کے کنارے خیمہ لگا ہوا ہے۔ قریب گئے کہ دیکھیں کون نیا آدمی آیا ہے اور اس کا کیا حال ہے۔ قریب پہنچے تو دیکھا ایک بدوی بیٹھا ہوا ہے، اندر سے کراہنے کی آواز آ رہی ہے، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ مسافر ہے اور اس کی عورت دردِ زہ میں مبتلا ہے۔ اس غریب کی پریشانی سے دل بھر آیا، تیزی سے گھر آئے، اپنی بیوی امِ کلثوم بنت علیؓ سے کہا، آؤ اللہ تعالیٰ نے تمھارے لیے ثواب حاصل کرنے کا موقع پیدا کیا ہے۔ یہ کہہ کر کھانے پینے، دوا علاج کا ضروری سامان ساتھ لے کر چل کھڑے ہوئے، خیمہ کے قریب پہنچے تو عورت کی تکلیف بدستور تھی، خدمت کے لیے بیوی کو اندر بھیجا، اور باہر چولہا جلایا اور کھانا تیار کرنے لگے، کچھ دیر کے بعد اندر سے بچہ کے رونے کی آواز آئی۔ حضرت امِ کلثومؓ نے پکار کر کہا، امیرالمومنینؓ! اپنے دوست کو خوش خبری سنا دیجیے۔ امیرالمومنین کا لفظ سن کر بدوی چونک پڑا۔ گھبرا کر حضرت عمرؓ کی طرف دیکھا اور کہا، امیرالمومنین آپ یہ تکلیف اٹھاتے ہیں، سن کر فرمایا، تکلیف کی کیا بات ہے، جس پر حکومت کی ذمہ داری ہے اس کا یہ فرض ہے۔

ایک اور رات کا ماجرا ہے کہ گشت کرتے ہوئے ایک جگہ پہنچتے ہیں، دیکھتے کیا ہیں کہ ایک خیمہ لگا ہوا ہے، اس کے پاس آگ جل رہی ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ پک رہا ہے، یہ قحط سالی کا زمانہ تھا، بڑے خوش ہوئے کہ شاید راحت کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ خوش خوش خیمہ کے قریب گئے، لیکن وہاں حال یہ تھا کہ خالی ہانڈی چولہے پر چڑھی ہوئی تھی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ماں نے بھوکے بچوں کو بہلانے کے لیے یہ کھانا پکانے کا بہانہ کر رکھا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر دل کو ٹھیس لگی اور سیدھے بیت المال واپس آئے، جلد جلد خورد و نوش کا سامان نکالا، گٹھری پیٹھ پر لادی، غلام نے چاہا کہ یہ بوجھ ان سے لے لے، لیکن آپؓ نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ کل قیامت میں تم میرا بوجھ نہیں اٹھاؤ گے۔ غرض کہ اس حال میں خیمہ تک پہنچے، آٹا گوندھا، چولہا جلایا، جب کھانا تیار ہوا اور بچوں نے کھایا تو باغ باغ ہو گئے۔ عورت بھی اس مہربانی سے بے حد متاثر ہوئی اور کہا کہ خلیفہ بنانے کے قابل تم ہو نہ کہ عمرؓ۔ آپؓ نے فرمایا کہ اچھی باتیں کرو، کل امیرالمومنین کے پاس آنا، مجھے انشاء اللہ وہاں پاؤ گی۔ جب عورت اپنے شوہر اور بچوں کے

ساتھ دارالخلافہ پہنچی تو اس نے حیرت سے دیکھا کہ رات کو چولہا پھونکنے والا ہی امیرالمومنین ہے۔

حضرت عمرؓ ہی کا دورِ حکومت ہے' شام فتح ہو چکا ہے' علاقہ کی دیکھ بھال کے لیے امیرالمومنین دورہ کر رہے ہیں۔ حمص پہنچتے ہیں اور سربرآوردہ اشخاص سے ملاقات ہوتی ہے تو حکم ہوتا ہے کہ شہر کے فقیروں اور حاجت مندوں کی فہرست پیش کریں۔ فہرست بن کر جو آتی ہے تو سرِفہرست امیرِشہر سعید ابن عامر کا نام نظر آتا ہے۔ حیران ہو کر دریافت فرماتے ہیں' یہ کون سعید ہیں' لوگوں نے کہا' ہمارے حاکم۔ اب امیرالمومنین کو اور تعجب ہوا۔ فرمایا کہ یہ محتاج کیسے ہو سکتے ہیں' انہیں تو سرکاری خزانہ سے رقم ملتی ہے' لوگوں نے کہا' ہاں یہ سچ ہے لیکن ان کی فیاضیٔ طبع کچھ باقی نہیں رہنے دیتی' جو ملتا ہے دوسرے اہلِ حاجت کو تقسیم کر دیتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے۔ پھر ایک ہزار دینار جناب سعید ابن عامر کے پاس بھیجے اور قاصد سے کہا کہ انہیں میری طرف سے سلام کہنا اور کہنا کہ امیرالمومنین نے یہ رقم بھیجی ہے۔ اسے اپنی ضرورت میں صَرف کیجیے۔ قاصد رقم لے کر پہنچا' امیرالمومنین کا خط دیا' پھر تھیلی پیش کی' دیناروں پر نظر پڑی تو زور سے کہا' **انا للہ وانا الیہ راجعون**' بیوی ذرا دور تھیں' ان کے کان میں یہ آواز پڑی تو گھبرا کر پوچھا خیریت ہے؟ کیا حادثہ پیش آیا' خدانخواستہ امیرالمومنین کی وفات تو نہیں ہوئی۔ فرمایا' نہیں' بلکہ اس سے بھی بڑھ کر واقعہ پیش آیا ہے۔ کہا' کیا کوئی خدا کی نشانی نمودار ہوئی ہے۔ فرمایا کہ اس سے بھی بڑھ کر حادثہ پیش آیا ہے۔ کہنے لگیں' آخر فرمایئے تو کیا بات ہے۔ آپ اس اضطراب کے ساتھ **انا للہ وانا الیہ راجعون** کیوں پڑھ رہے ہیں' فرمایا' دیکھو! یہ دنیا میرے پاس آ گئی ہے۔ ہائے' فتنہ میرے گھر میں داخل ہو گیا ہے۔ سعادت مند بیوی نے تسکین دیتے ہوئے کہا' آپ پریشان نہ ہوں۔ یہ رقم جس طرح چاہیں رضائے الٰہی میں صَرف کر دیں۔ بیوی کی یہ بات سن کر دل کو ذرا قرار ہوا۔ رقم ایک تھیلی میں باندھ کر رکھ دی۔ کچھ دنوں کے بعد مجاہدین کا ایک قافلہ ادھر سے گزرا تو یہ ساری رقم ان کی ضروریات پر صَرف کر دی۔

دنیا سے بے رغبتی کا عجیب حال تھا' اپنے فرائض کی انجام دہی کے سوا کسی اور کام کی فکر نہ تھی' نہ کھانے کی طرف توجہ تھی' نہ پہننے کی طرف رغبت۔ کئی کئی دن گھر میں آگ نہ جلتی تھی' لوگ سمجھاتے تھے کہ اس قدر تکلیف کیوں اٹھاتے ہو' لیکن اس اللہ والے پر کوئی اثر نہ ہوتا' ایک مرتبہ لوگ اکٹھا ہو کر آئے اور کہا کہ آپ پر اپنی جان کا حق ہے' اپنے عزیزوں کا حق ہے'

اپنے اہل و عیال کا حق ہے، کچھ تو ان کے لیے سامان چاہیے۔ لیکن سب کی سننے کے بعد اللہ کے اس نیک بندے نے کہا کہ میں کسی کی خاطر اپنی منزل کھوٹی نہیں کر سکتا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ فقراء و مساکین، اغنیاء سے بہت پہلے جنت میں داخل ہو جائیں گے۔

حکومت و امارت کی جانب لوگ لپکتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہو یہ عزت و سربلندی انھیں حاصل ہو جائے، لیکن جن اللہ کے بندوں کو اس کی ذمہ داریوں کا خیال ہے اور جانتے ہیں کہ کل خدا کے سامنے پوری رعایا کی طرف سے جواب دہی کرنی پڑے گی، وہ حکومت سے بھاگتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کی گردن اس جوئے کے بوجھ سے آزاد رہے۔ حضرت سعید بن عامر بھی انھیں بزرگوں میں تھے، جن کی نظر میں حکومت، راحت و آرام کا پیام نہیں ہے بلکہ ذمہ داریوں کی گرانباری کا نام ہے، اس احساس کا نتیجہ تھا کہ جب حضرت عمرؓ نے انھیں حمص کی امارت کے لیے منتخب کیا تو انھوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح انھیں اس سے محفوظ رکھا جائے۔ بڑے الحاح کے ساتھ حضرت عمرؓ سے معذوری ظاہر کی، لیکن امیرالمومنین نے فرمایا کہ نہیں، خدا کی قسم یہ نہیں ہو سکتا، تم لوگوں نے مجھے خلافت کی شدید ذمہ داریوں میں مبتلا کر دیا اور خود چاہتے ہو کہ حکومت کی ذمہ داری سے آزاد رہو، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا، تم نے میرے سر پر بوجھ رکھا ہے تو اس کے اٹھانے میں شریک ہونا پڑے گا۔

سروری در دینِ ما خدمت گری است

ان ہی سعید ابن عامرؓ کا واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ ان کے علاقہ کے لوگوں نے حضرت عمرؓ کی خدمت میں شکایت کی، لوگوں نے بیان کیا کہ جب تک اچھا خاصا دن نہیں چڑھ آتا اس وقت تک گھر سے برآمد نہیں ہوتے اور رات میں کسی کی آواز کا جواب نہیں دیتے۔ مہینہ میں ایک دن بالکل ہی گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ حضرت عمرؓ کو سخت تعجب ہوا کہ ایسا خدمت پسند اور رعایا کی فکر رکھنے والا آدمی کس طرح لوگوں کی خدمت سے غفلت برت سکتا ہے۔ لیکن چونکہ شکایت سامنے چکی تھی، اس لیے اطلاع بھیج کر سعید ابن عامرؓ کو طلب کیا، جب وہ آ گئے تو ان کے سامنے لوگوں سے پوچھا کہ اب کہو تمھیں کیا شکایت ہے؟ لوگوں نے شکایتیں دھرائیں، حضرت عمرؓ نے پوچھا اے سعید! تمھارے پاس اس کا کیا جواب ہے۔ سعید نے کہا کہ خدا کی قسم میں اس کا ذکر نہیں پسند کرتا تھا لیکن چارۂ کار کیا ہے۔ بات یہ ہے کہ میرے گھر میں کوئی ملازم نہیں ہے جو گھر

کے کاموں میں مدد دیا کرے۔ بیوی کے لیے تمام کاموں کی انجام دہی دشوار ہے۔ اس لیے میں صبح جب گھر جاتا ہوں تو آٹا گوندھتا ہوں' پھر بیٹھ کر خمیر اٹھنے کا انتظار کرتا ہوں' اس کے بعد روٹی پکاتا ہوں' پھر ہاتھ منہ دھو کر ان لوگوں کی خدمت کے لیے باہر نکلتا ہوں۔ اس جواب کے بعد ان لوگوں نے دوسری شکایت پیش کی کہ یہ رات بڑھے صبح تک کسی کا جواب نہیں دیتے۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا' اس کا کیا جواب ہے۔ حضرت سعید نے کہا' میں یہ ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن اب یہ بات آن پڑی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میں نے دن ان کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے اور رات اللہ تعالیٰ کے لیے' جب رات آتی ہے تو ان کی ضرورتوں سے فارغ ہو کر عشاء کے بعد گھر کے اندر چلا جاتا ہوں اور اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو جاتا ہوں۔

اب ان لوگوں نے تیسری شکایت پیش کی کہ مہینہ میں ایک دن یہ بالکل گھر سے باہر نہیں نکلتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا' سنتے ہو لوگ کیا کہہ رہے ہیں۔ سعید بن عامرؓ نے عرض کیا کہ اے امیرالمومنین! واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس ایک کپڑے کے سوا دوسرا کپڑا نہیں ہے جسے میں میلا ہونے کے بعد بدل لیا کروں' نہ میرے پاس کوئی خادم ہے جو میرے کپڑے دھو دیا کرے' اس وجہ سے جب کپڑے بہت میلے ہو جاتے ہیں تو میں انھیں اتار کر خود دھوتا ہوں' پھر جب وہ سوکھ جاتے ہیں تو پہن کر باہر نکلتا ہوں' اس کام میں دن کا بڑا حصہ گزر جاتا ہے۔ یہ جواب سن کر حضرت عمرؓ کا چہرہ فرطِ مسرت سے چمک اٹھا اور بے اختیار فرمانے لگے' خدا کا شکر ہے کہ اس نے میری بصیرت ان کے بارے میں غلط نہیں کی' اس کے بعد سعید ابن عامرؓ کے پاس ایک ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا' اس سے اپنی ضرورت پوری کر لو۔ ان کی بیوی نے دیکھا تو بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں' اس سے ایک غلام خرید لیا جائے تاکہ گھر کے مشاغل سے کچھ فرصت نصیب ہو' لیکن حضرت سعیدؓ نے کہا' کیا تمھیں اس سے بہتر چیز مرغوب نہیں ہے کہ یہ دینار ہم ایسے لوگوں کی خدمت میں صرف کریں جو ہم سے زیادہ محتاج و پریشان ہیں۔ اللہ نے انھیں بیوی بھی بڑی نیک بخت بخشی تھی' وہ سنتے ہی راضی ہو گئیں۔

حضرت سعیدؓ نے ایک معتبر شخص کو بلایا' الگ الگ پوٹلیوں میں دینار باندھے اور اس کے حوالے کیے اور حکم دیا کہ فلاں خاندان کی بیوہ تک پہنچا دو' اسے فلاں یتیم کو دے آؤ' اسے فلاں مسکین کے پاس لے جاؤ' اسے فلاں بیمار کے حوالے کر دو۔

حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ کے ایک اور حاکم عمیر بن سعدؓ ہیں' یہ بھی حمص میں متعین تھے۔

حضرت عمرؓ نے انہیں جب اس علاقہ کا حاکم بنا کر بھیجا تو ایک سال تک ان کے یہاں سے کوئی اطلاع نہیں آئی' آخر حضرت عمرؓ نے انہیں خط لکھ کر بلایا اور یہ تاکید کی کہ جو کچھ رقم تم نے وصول کی ہو اسے اپنے ساتھ لیتے آؤ' خط ملتے ہی عمیرؓ نے اپنا ڈنڈا ہاتھ میں لیا اور ایک تھیلہ میں زادِ راہ رکھ کر کندھے پر ڈال لیا اور حمص سے مدینہ پیدل چل پڑے' جب مدینہ منورہ پہنچے تو راستہ کی تکان اور منزل کی دوری کی وجہ سے ان کا یہ حال تھا کہ بال بڑھ گئے تھے' چہرہ غبار سے اٹ گیا تھا اور جسم کا رنگ بدل گیا تھا' حضرت عمرؓ نے یہ حال دیکھا تو پوچھا کہ تمہاری کیا حالت ہے۔ عمیرؓ نے جواباً کہا کہ امیرالمومنین دیکھ رہے ہیں' اچھا خاصا ہوں' میرے ساتھ دنیا ہے جسے میں کھینچ رہا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا' آخر تمہارے پاس ہے کیا۔ عرض کیا' یہ میرا تھیلہ ہے' اس میں میری زادِ راہ ہے' میرا پیالہ ہے جس میں میں کھاتا ہوں اور جس میں اپنا سر اور کپڑے دھوتا ہوں اور چھوٹا سا مشکیزہ ہے جس میں وضو اور پینے کا پانی رکھتا ہوں' اس کے علاوہ میرا ڈنڈا ہے جس پر میں ٹیک لگاتا ہوں اور ضرورت کے وقت دشمن کا مقابلہ کرتا ہوں' خدا کی قسم اور دنیا کسے کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا' کیا تم پیدل آئے ہو' عرض کیا' ہاں۔ فرمایا' کیا وہاں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو تمہارے ساتھ حسنِ سلوک کرتا اور تمہارے لیے کسی سواری کا انتظام کر دیتا۔ کہا' نہ میں نے ان سے کوئی سوال کیا نہ انہوں نے ایسا کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا' وہ مسلمان کتنے برے ہیں جن کے پاس سے تم آئے ہو۔ یہ سن کر عمیرؓ بولے' امیرالمومنین! اللہ سے ڈریے' اللہ نے آپ کو غیبت سے روکا ہے' وہ لوگ مسلمان ہیں' میں نے انہیں نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ اب حضرت عمرؓ نے ان کی ذمہ داریوں کا جائزہ لینا شروع کیا' دریافت کیا' تمہیں معلوم ہے میں نے کہاں بھیجا تھا' تم نے کیا کارگزاری دکھائی۔ بولے' آپ نے مجھے جہاں بھیجا میں اس شہر میں گیا' وہاں کے نیک لوگوں کو جمع کیا اور انہیں محاصل کی وصولیابی کے لیے مقرر کیا اور جب انہوں نے حاصل کر لیا تو اسے اس کے مصارف میں صرف کر دیا' (یہ اشارہ ہے **توخذ من اغنیا ئھم وترد علیٰ فقرا ئھم** کی طرف)۔

اگر آپ بھی اس کے مستحق ہوتے تو میں آپ کے پاس بھی ضرور لاتا' حضرت عمرؓ اس بیان سے بے انتہا خوش ہوئے اور حکم دیا کہ عمیرؓ کو پھر ان کے عہدہ پر قائم رکھا جائے۔ لیکن حضرت عمیرؓ دوبارہ یہ ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور عرض کیا کہ امیرالمومنین اب میں اس کام سے معافی چاہتا ہوں۔ نہ آپ کے زمانہ میں نہ آپ کے بعد میں کبھی یہ ذمہ داری قبول کروں گا' ہزار احتیاطوں کے بعد بھی خدا کے مواخذہ سے امن نہیں' میں نے بہت کوشش کی کہ حکمران

کی بو سے اپنے کو محفوظ رکھوں لیکن ایک دن ایک نصرانی کے لیے میرے منہ سے نکل ہی گیا کہ "اللہ تجھے خوار کرے"۔ اس کے بعد اجازت چاہی اور اپنے گھر واپس آ گئے جو مدینہ سے کافی فاصلہ پر تھا، ان کے جانے کے بعد حضرت عمرؓ نے ایک شخص کو سو دینار دے کر ان کے پاس روانہ کیا، یہ صاحب ان کے مکان پر پہنچے تو وہ دیوار کے سہارے بیٹھے ہوئے اپنے کرتے سے جوں صاف کر رہے تھے، ان کو دیکھ کر کہا، آیئے تشریف رکھیے، آپ کہاں سے آ رہے ہیں، قاصد نے جواب دیا، مدینہ سے آ رہا ہوں۔ پوچھا، امیرالمومنین کا کیا حال ہے؟ کہا، اچھے ہیں، اللہ کے قوانین کا نفاذ کر رہے ہیں، یہ سن کر کہنے لگے، اے اللہ، عمرؓ کی مدد کر، وہ تیری محبت میں سخت ہیں۔ تین دن یہاں قاصد نے قیام کیا، حضرت عمیرؓ کے گھر کی حالت یہ تھی کہ مشکل سے روٹی کی ٹکیا میسر ہوتی تھی جس کو مہمان کے سامنے رکھ دیتے تھے اور خود فاقے سے پڑ رہتے تھے۔ جب ان کی حالت اس طرح تکلیف وہ پریشان نظر آئی تو قاصد نے دینار نکال کر پیش کیے اور کہا، یہ امیرالمومنین نے آپ کی ضرورت کے لیے بھیجے ہیں، لیکن عمیرؓ ابن سعد کی غیرت مند طبیعت نے کسی طرح گوارا نہ کیا کہ یہ ہدیہ قبول کریں۔ کہنے لگے، مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور فوراً ہی محتاجوں اور یتیموں کو تقسیم کر دیا۔ یہ رنگ دیکھ کر قاصد مدینہ واپس آ گیا اور حضرت عمرؓ کو سارا ماجرا سنایا۔ حضرت عمرؓ نے انھیں بلا بھیجا، جب وہ آئے تو انھیں غلہ کی معقول مقدار اور دو کپڑے عنایت کیے، لیکن انھوں نے یہ کہہ کر غلہ قبول کرنے سے معذرت کی کہ مجھ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے ---- دو صاع (تقریباً سات سیر) جو گھر پر چھوڑ کر آ رہا ہوں، البتہ کپڑے قبول کر لیے اور کہا، میری بیوی ننگی ہے، اس کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کوئی کپڑا نہیں ہے، اس کے بعد اپنے گھر واپس آئے۔ تھوڑے دن کے بعد وفات پائی۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ملی تو سخت رنج ہوا، ان کے لیے دعائے رحمت کی، پا پیادہ قبرستان تشریف لے گئے۔ فرمایا، اے کاش مجھے عمیرؓ جیسا کوئی آدمی نصیب ہو، جس سے میں مسلمانوں کے معاملات کی انجام دہی میں مدد لوں۔

عہدِ فاروقی کے ایک حاکم حضرت حذیفہؓ بن الیمان ہیں، حضرت عمرؓ نے انھیں ایرانی پایۂ تخت مدائن کی حکومت سپرد کی۔ آپ نے امیروں اور حاکموں کے داخلہ کے شاندار منظر دیکھے ہوں گے اور ان سے زیادہ شاندار اور پرشکوہ مناظر کے تذکرے کتابوں میں پڑھے ہوں گے، لیکن حضرت حذیفہؓ نوشیروانی عظمت و جلال اور کیانی شکوہ وجبروت کے مرکز مدائن میں کس شان سے قدم رکھ رہے ہیں۔ ذرا یہ بھی سن لیجیے۔ خچر پر سوار ہیں جس پر زین بھی نہیں ہے، صرف نیچے ایک

بوسیدہ سا چار جامہ پڑا ہوا ہے' ایک ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا ہے' اور دوسرے میں گوشت کی ہڈی' لوگ گورنر کے استقبال کے لیے شہر سے باہر آئے اور آمد آمد کے منتظر ہیں' لیکن گورنر آتے ہیں اور ان کے سامنے سے گزر جاتے ہیں' مگر انہیں احساس بھی نہیں ہوتا کہ کب آئے اور کب نکل گئے' ان کی آنکھیں کیانی امراء کے شاندار جلوس دیکھ چکی تھیں' وہ پایۂ تخت مدائن کے گورنر کا ایسا سادہ تصور کہاں سے لاتے' جب انتظار کرتے کرتے خاصا عرصہ گزر گیا تو انہوں نے اور آتے ہوئے لوگوں سے پوچھا کہ امیر کی سواری کہاں ہے تو لوگوں نے کہا وہی تو ہیں جو ابھی شانِ بے نیازی کے ساتھ تمہارے پاس سے گزر گئے ہیں۔ حیران ہو کر گھوڑے دوڑائے اور جھپٹ کر حضرت حذیفہؓ کے قریب پہنچے اور سلام کیا' وہ اس وقت اسی بے تکلفی کے ساتھ سواری ہی کی حالت میں کھانا کھا رہے تھے جس کا ذکر اوپر کی سطور میں ہو چکا ہے۔ اسلامی مہمان نوازی نے گوارا نہ کیا کہ تنہا کھاتے رہیں' بے تکلفی سے وہی روٹی اور ہڈی ایرانی معززین کی خدمت میں پیش کر دی۔ ایران کے پر تکلف' نازک مزاج اور لطیف الطبع رئیس بھلا کس طرح ایسی معمولی چیز کھا سکتے تھے' انہوں نے نظر بچا کر پھینک دی' اس کے بعد مزاج پرسی اور گفتگو شروع ہوئی۔ ایرانی سرداروں نے کہا کہ آپ کو جس چیز کی ضرورت ہو' ہم سے طلب فرما لیجیے گا۔ حضرت حذیفہؓ نے فرمایا کہ صرف پیٹ میں ڈال لینے کے لیے کچھ کھانا اور جانور کے لیے چارہ چاہیے اور اس کے سوا کسی چیز کی ضرورت نہیں۔

ایک عرصہ تک اس سادگی کے ساتھ مدائن میں قیام رہا' اور مشقت و تندہی کے ساتھ رعایا کی خدمت کرتے رہے' کچھ دنوں کے بعد حضرت عمرؓ نے انہیں مدینہ منورہ آنے کی دعوت دی۔ جب معلوم ہوا کہ وہ آ رہے ہیں تو آگے بڑھ کر راستہ میں چھپ کر ایک جگہ کھڑے ہو گئے' جب حضرت حذیفہؓ ان کے قریب سے گزرے اور انہوں نے دیکھا کہ ان کی حالت میں حکومت و امارت کی وجہ سے کوئی تغیر نہیں ہوا' بلکہ بدستور وہی حال ہے جس حال میں وہ مدینہ منورہ سے روانہ ہوئے تھے تو نکل کر سامنے آئے اور فرطِ محبت سے لپٹ گئے اور فرمانے لگے "اے حذیفہؓ تم میرے بھائی ہو اور میں تمہارا بھائی ہوں"۔

حضرت حذیفہؓ کو فقروفاقہ بہت محبوب تھا' ہمیشہ راحت و آرام سے دور بھاگتے' امارت و ریاست سے طبیعت کو کوئی لگاؤ نہ تھا' لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے کہ فتنہ کی جگہوں سے دور رہیں' لوگوں نے پوچھا کہ حضرت! فتنہ کی جگہوں سے کیا مراد ہے۔ کہا "حاکموں اور امیروں کے دروازے پر' لوگ امیروں کے پاس جاتے ہیں' ان کے جھوٹ کی تصدیق کرتے ہیں' اور خواہ مخواہ

ان کی تعریف کرتے ہیں"۔

دنیا سے طبیعت کو بے حد نفور تھا' فرمایا کرتے تھے' جی چاہتا ہے کہ دروازہ بند کر کے بیٹھ جاؤں اور کسی سے نہ ملوں' یہاں تک کہ خدا کے حضور میں پہنچ جاؤں' نماز پڑھتے تو سخت رقت طاری ہوتی۔ ایک دن کسی شخص نے دیکھ لیا تو اس کو تاکید کی کہ خبردار اس حال سے کسی کو مطلع نہ کرنا۔

انتقال کے وقت عجیب حال تھا' اللہ تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہتے تھے' "یااللہ تو خوب جانتا ہے کہ میں زندگی پر موت کو ترجیح دیتا رہا ہوں' عزت وشان کے مقابلہ میں مجھے بے حیثیتی زیادہ محبوب رہی ہے' اور میں نے مال داری اور تونگری کے مقابلہ میں فقروفاقہ کو ہمیشہ پسند کیا ہے۔" لوگ انتقال کے قریب کفن لے کر آئے۔ پوچھا' تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟ انہوں نے پیش کیا۔ اچھا خاصا قیمتی کپڑا تھا۔ فرمانے لگے:

> میرے لیے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ معمولی سے سفید ٹکڑے کافی ہیں' اگر میرے اعمال اچھے ہوں گے تو اللہ تعالیٰ اس سے بہتر پوشاک پہنا دے گا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خادم حضرت اسلمؓ کا بیان ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ کے ساتھ میں بازار کی طرف گیا۔ وہاں انہیں ایک عورت ملی' اس نے کہا' اے امیرالمومنین! میرے شوہر ہلاک ہو گئے ہیں اور انہوں نے چھوٹے چھوٹے بچے اپنے بعد چھوڑے ہیں۔ جن کے لیے کھانے پینے کا کوئی سامان نہیں ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ وہ ضائع نہ ہو جائیں۔ میرے باپ خفاف بن ایماء غفاری ہیں' انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حدیبیہ میں شرکت کی ہے۔ اتنا سننا تھا کہ حضرت عمرؓ ٹھہر گئے۔ پھر ایک اونٹ لائے اور اس پر دو بورے سامانِ خوراک لادا اور ان دونوں کے درمیان کپڑے اور خرچ کے لیے کچھ روپیہ رکھا' پھر اس کے ہاتھ میں اونٹ کی مہار دے دی اور کہا کہ اسے لے جاؤ یہ ختم نہ ہونے پائے گا کہ اللہ تمہارے پاس اور پہنچائے گا۔ ایک شخص یہ منظر دیکھ رہا تھا' اسے اتنی زیادہ فیاضی پر تعجب ہوا اور اس نے کہا' اے امیرالمومنین! آپ نے اسے بہت دے دیا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے بگڑ کر جواب دیا' خدا کی قسم اس عورت کے باپ اور بھائی کے کارنامے میری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ ایک قلعہ کا انہوں نے طویل زمانہ تک محاصرہ کیا اور بالآخر اسے فتح کر لیا جس کے ثمرات سے ہم فائدہ حاصل کر رہے ہیں۔ ان کا یہ کارنامہ آج بھی میرے حافظہ میں ایسا تازہ ہے کہ گویا میں اس کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔

حضرت عمرؓ کی خدمت گزاری اور رعایا پروری کا یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے' ان کی زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ ایک اور موقعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ رات کی تاریکی میں اپنے گھر سے نکلے' پھر ایک گھر میں داخل ہوئے' اس کے بعد دوسرے گھر میں گئے۔ حضرت طلحہؓ نے اتفاق سے ان کی یہ نقل و حرکت دیکھ لی۔ انہیں فکر ہوئی' امیرالمومنین رات کس گھر میں گئے تھے' صبح ہوئی تو اس مکان پر گئے تاکہ حالات کا پتہ چلائیں' لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ ایک لنجی اپاہج بوڑھی عورت وہاں رہتی ہے۔ حضرت طلحہؓ نے اس سے پوچھا کہ یہ صاحب تمہارے پاس کس غرض سے آتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ زمانہ دراز سے یہ میری خبرگیری کرتے ہیں۔ ان کا معمول ہے کہ میرے پاس آتے ہیں' میری ضروریات کی فکر لیتے ہیں' میرے یہاں سے کوڑاکرکٹ نکال کر باہر پھینکتے ہیں اور میرے کام کاج انجام دیتے ہیں۔ حضرت طلحہؓ نے حضرت خلیفۃ المسلمین کی خادمانہ زندگی اور ان کے جذبۂ خدمت کو سنا تو سناٹے میں آ گئے۔

تاجروں کے قافلے آتے' ان کی نگہبانی اور حفاظت کا پورا انتظام کرتے۔ ایک مرتبہ سوداگروں کا ایک گروہ آیا۔ حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو بذاتِ خود ان کی پاسبانی کا ارادہ کیا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کا بیان ہے کہ میرے پاس آئے اور مجھ سے کہا کہ آؤ آج رات ان لوگوں کی حفاظت کریں۔ چنانچہ میں ان کے ساتھ گیا اور ہم دونوں رات بھر چوکیداری کے فرائض انجام دیتے رہے' درمیان میں نماز بھی پڑھتے جاتے تھے۔ رات کے دوران میں ایک بچے کے رونے کی آواز آئی' حضرتِ عمرؓ اس کے پاس گئے اور اس کی ماں سے کہا' برائے خدا اپنے بچے کی طرف توجہ کر' لیکن تھوڑی دیر کے بعد بچہ پھر رویا۔ اس کی آواز سن کر آپؓ اس کی ماں کے پاس پھر گئے اور اسے اسی طرح نصیحت کی۔ رات کے آخر حصہ میں بچہ پھر رویا۔ آپؓ حسبِ سابق اس کی ماں کے پاس آئے اور اسے ملامت کرنے لگے کہ تو بڑی بری ماں ہے' بچہ کی طرف ذرا بھی توجہ نہیں کرتی' اس نے ساری رات قرار نہیں پکڑا۔ عورت نے بگڑ کر کہا' اے خدا کے بندے! تو نے مجھے رات بھر پریشان کیا' میں اس بچہ کا دودھ چھوڑانا چاہتی ہوں' یہ بچہ چھوڑنا نہیں چاہتا اور ضد کرتا ہے۔ آپؓ نے پوچھا' آخر تجھے دودھ چھڑانے کی کیا ضرورت پیش آئی ہے' اس نے کہا' وجہ یہ ہے کہ حضرت عمرؓ دودھ چھٹنے ہی کے بعد بچوں کا وظیفہ مقرر کرتے ہیں۔ آپؓ نے پوچھا' بچہ کی عمر کیا ہے؟ اس نے کہا' ابھی چند ماہ کا ہے۔ آپؓ نے فرمایا' ہائے افسوس! جلدی نہ کر!! اس کے بعد آپؓ نے فجر کی نماز پڑھی۔ اس واقعہ کا طبیعت پر اتنا اثر تھا کہ دورانِ نماز میں اتنا گریہ طاری ہوا اور اس قدر روتے رہے کہ لوگوں کو صاف طریقہ سے ان کی قرات کا پتہ نہ

چل سکا۔ جب سلام پھیرا تو فرمایا' ہائے افسوس عمر کے لیے! معلوم نہیں اس نے مسلمانوں کے کتنے بچے قتل کرائے۔ اس کے بعد آپؓ نے منادی کو بلا کر حکم دیا کہ اس بات کا اعلان کر دے کہ اپنے بچوں کو دودھ چھوڑانے میں جلدی نہ کریں' میں بچہ کے پیدا ہوتے ہی ہر ایک کا وظیفہ مقرر کر دوں گا۔ یہی اعلان ساری اسلامی مملکت میں کرا دیا۔

آپ کے زمانہ میں ایک سال بہت سخت قحط پڑا۔ لوگ فقروفاقہ کی شدید مصیبت میں مبتلا تھے۔ اس وقت آپکی پریشانی حد سے بڑھ گئی۔ جہاں تک دور دور ملکوں میں غلہ دستیاب ہو سکا' منگایا اور لوگوں کے درمیان تقسیم کیا۔ مصر سے غلہ کی بہت بڑی مقدار منگوائی اور حاجتمندوں تک پہنچائی' لیکن اس انتظام کے بعد بھی طبیعت کو چین نہیں آیا۔ پریشان ہو ہو کر دعائیں مانگتے تھے اور کہتے تھے کہ یا اللہ اگر میں اپنی کسی غلطی کی وجہ سے مستحقِ سرزنش ہوں تو میری وجہ سے اپنی مخلوق کو وبال میں مبتلا نہ کر۔ دوسرے لوگوں سے دعائیں منگواتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ کے واسطے سے دعائیں مانگتے' اس زمانہ میں آپ نے عہد کر رکھا تھا کہ کبھی سیر ہو کر نہیں کھائیں گے' نہ کوئی اچھا کھانا کھائیں گے۔ اکثر فاقے سے گزارتے۔ گھر والوں کا بھی یہی حال تھا۔ اس مشقت کی وجہ سے ان کے جسم کا رنگ بدل گیا اور بہت لاغر ہو گئے تھے۔ اس زمانہ میں ایک دن لوگوں نے ایک اونٹ ذبح کیا' لوگوں کو اس میں سے کھلایا اور کچھ حضرت عمرؓ کے پاس بھیج دیا۔ آپ نے پوچھا کہ کہاں سے آیا ہے۔ لوگوں نے کہا' آج اونٹ ذبح کیا تھا' لیکن آپؓ نے اسے کھانا گوارا نہ کیا اور حکم دیا کہ برتن سامنے سے اٹھا لیے جائیں' لوگوں نے بہت اصرار کیا تو آپ نے فرمایا' میں بہت ہی برا حاکم ہوں گا اگر اچھی چیز کھاؤں۔ اس کے بعد آپ کے لیے روٹی اور زیتون کا تیل لایا گیا جسے آپ نے کھایا۔

اپنی حکومت کی ذمہ داری کا بہت شدت سے احساس تھا۔ بیمار اونٹوں کو اگر تیل ملنے کی ضرورت ہوتی تو اپنے ہاتھ سے ملتے' اگر کوئی جانور گم ہو جاتا تو خود اسے ڈھونڈھنے نکلتے' فرمایا کرتے تھے کہ اگر فرات کے کنارے کوئی بکری کا بچہ بھی مرجائے گا تو میں ڈرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس کا محاسبہ مجھ سے کرے گا۔

رعایا کے مال سے بہت پرہیز کرتے۔ پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اور موٹا جھوٹا کھا کر ساری زندگی گزار دی' حضرت حسنؓ کا بیان ہے کہ میں نے حضرت عمرؓ کو اس زمانہ میں دیکھا جب وہ خلیفہ تھے۔ منبر پر کھڑے ہوئے لوگوں کو تلقین کر رہے تھے۔ لیکن کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔ میں نے آپ کے تہبند پر شمار کیا تو بارہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے چاہا کہ حضرت

عمرؓ کچھ آرام اٹھالیں، ان کی ناراضگی کے خیال سے خود تو کہنے کی ہمت نہ پڑی، بالآخر ام المومنین حضرت حفصہؓ کو راضی کیا کہ وہ انہیں اس بات پر مائل کریں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنا فضل فرمایا ہے اور رزق اب مسلمانوں کے پاس خاصا ہو گیا ہے تو اس قدر تکلیف کیوں اٹھا رہے ہیں، اس کھانے سے کچھ بہتر کھانا کھانے لگیں اور ان کپڑوں سے کچھ ملائم کپڑے پہننے لگیں۔ حضرت حفصہؓ نے ایک دن مناسب موقع سے اس کا ذکر کیا، لیکن حضرت عمرؓ نے فرمایا، اے حفصہؓ! ذرا خیال تو کرو، تمہیں یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح زندگی بسر کرتے تھے اور ان کی کیسی تلخی اور ترشی سے گزرتی تھی، یہی حال حضرت ابوبکرؓ کا تھا۔ خدا کی قسم! میں ان کی طرح سے شدید اور سخت زندگی اختیار کروں گا، شائد آئندہ ان کی نرم اور آرام دہ زندگی میں شرکت نصیب ہو۔ حضرت عمرؓ نے یہ الفاظ کچھ اس طرح کہے اور رسولؐ اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کی تکلیفات کا حال کچھ اس طرح بیان کیا کہ حضرت حفصہؓ بھی رونے لگیں۔

اپنی ذمہ داری کا اتنا سخت احساس تھا کہ اگر کسی کی خدمت میں کوتاہی ہو جاتی یا اس کو کوئی تکلیف پہنچ جاتی تو بے چین ہو جاتے۔ جب تک اس کا بدلہ نہ چکا دیتے تھے قرار نہیں آتا تھا۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ جمعہ کا دن تھا، آپ نے کپڑے بدلے اور نماز پڑھنے کے لیے مسجد روانہ ہوئے۔ راستہ میں حضرت عباسؓ کا مکان تھا، پرنالہ راستہ ہی کی طرف تھا۔ اس دن حضرت عباسؓ کے یہاں دو پرندے ذبح کیے گئے تھے۔ حضرت عمرؓ جس وقت پرنالے کے پاس سے گزرے ٹھیک اسی وقت کوٹھے پر خون دھونے کے لیے پانی انڈیلا گیا اور وہ خون اور پانی آپ کے کپڑوں پر گرا۔ آپ کی طبیعت کو بے حد ناگواری ہوئی۔ حکم دیا کہ یہ پرنالہ اکھیڑ کر پھینک دیا جائے۔ پھر اپنے گھر واپس آئے، وہ کپڑے اتار کر دوسرے کپڑے پہنے۔ اس کے بعد نماز پڑھنے کے لیے آئے، نماز کے بعد حضرت عباسؓ آپ کے پاس آئے اور کہا، خدا کی قسم پرنالہ اسی جگہ تھا جہاں اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا تھا۔ حضرت عمرؓ کو اپنے فعل پر بے حد ندامت ہوئی۔ پرنالہ کے پاس جا کر کھڑے ہوئے اور فرمایا، اے عباسؓ میں تمہیں قسم دلاتا ہوں کہ تم میری پیٹھ پر چڑھ جاؤ اور جس جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لگایا تھا وہیں لگا دو۔ حضرت عباسؓ کا جی نہ چاہتا تھا لیکن امیرالمومنین کے حکم نے مجبور کر دیا اور ان کی پیٹھ پر چڑھ کر پرنالہ لگا دیا۔

ایک اور واقعہ اسی طرز کا ہے۔ ایک دن آپ بازار سے گزر رہے تھے تاکہ حالات کو سمجھ سکیں اور خرید و فروخت میں کمی زیادتی نہ ہونے دیں۔ راستہ میں لوگ بھیڑ کیے ہوئے تھے۔ لوگوں کو چلنا دشوار تھا۔ ایک جگہ ایک شخص بالکل سرِراہ راستہ روکے ہوئے پڑا تھا۔ حضرت عمرؓ نے

بقیہ بر صفحہ ۱۳

یونان اور البانوی تارکینِ وطن کا مسئلہ

محمد الیاس انصاری

آج کل بلقان کے خطے میں نسلی کشیدگی کے نئے نئے محاذ کھل رہے ہیں۔ بوسنیا میں جاری سرب بربریت اور دہشت گردی و مسلم کشی اپنے مکمل عروج پر ہے' جب کہ کوسووہ اور مقدونیہ میں نسل کشی کے ایسے ہی شعلے بھڑکنے کے بارے میں خدشات کا اظہار جاری ہے۔ ادھر یورپی عیسائی آرتھوڈوکس ملک اور یورپی برادری کے رکن ملک یونان نے فروری ۹۳ سے یونان میں موجود البانوی[1] پناہ گزینوں کے خلاف مذہبی و نسلی تعصب کا مظاہرہ شروع کر دیا ہے جو اس وقت اس کشیدہ خطے میں مزید کشیدگی کا سبب بن رہا ہے۔

البانیہ ۷۵ فیصد مسلم آبادی والا ملک ہے۔ یہاں ۲۵ فیصد عیسائی بستے ہیں جن کی غالب اکثریت آرتھوڈوکس فرقے سے تعلق رکھتی ہے' تاہم رومن کیتھولک بھی معقول تعداد کے حامل ہیں۔ بیشتر آرتھوڈوکس یونانی النسل ہیں۔ اس یونانی النسل گروہ کی تعداد کے بارے میں البانوی اور یونانی حکومتوں کے درمیان شدید اختلاف پایا جاتا ہے[2]۔

فروری ۹۳ کے شروع میں البانیہ نے یونانی وزارت خارجہ کے ایک بیان پر شدید ناراضگی کا اظہار کیا تھا۔ یونانی وزارت خارجہ نے کہا تھا کہ البانیہ میں نئے مذہبی قوانین کے اطلاق سے یونانی آرتھوڈوکس چرچ کے البانوی مگر یونانی النسل پیروکاروں کو امتیازی سلوک کا سامنا کرنا پڑے گا کیونکہ اس قانون کی رو سے اعلیٰ مسیحی مذہبی مناصب پر البانوی النسل فائز ہوں گے[3]۔ اور یونانی النسل افراد کی حق تلفی ہوگی۔

اس واقعے کو بنیاد بنا کر یونانی حکومت نے اپنے ملک میں البانوی تارکینِ وطن کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیا' جہاں پہلے ہی تقریباً ساڑھے تین لاکھ تارکینِ وطن غیر قانونی طور پر رہ رہے ہیں اور ان میں یونانی وزارتِ داخلہ کے اندازے کے مطابق غیر قانونی البانوی تارکینِ

وطن کی تعداد ڈیڑھ لاکھ سے تین لاکھ تک ہے۴۔ ان تارکینِ وطن کی یونان میں آمد کی متعدد وجوہات ہیں۔ ان میں بڑی وجہ اشتراکیت کا زوال ہے ۵۔ اس وقت سے اب تک تقریباً ساڑھے تین لاکھ البانوی باشندے پہاڑوں اور سرحدی مقامات کو عبور کر کے یونان میں داخل ہوئے۔ سابق سوویت یونین سے یونانی النسل اقلیت کے تقریباً ۴۰ ہزار باشندے یونان آئے' ۵۰ ہزار سیاسی مہاجرین جن میں ترک' کرد' عراقی' ایرانی' ایتھوپیائی اور صومالی شامل ہیں' ان سب کو یونان میں قانونی تارکِ وطن کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن بہت سے تارکینِ وطن ایسے بھی ہیں جنہیں منظم گروہ یہاں لائے۔ پچھلے برس ۹۲ میں تقریباً ۲ ہزار عراقی' ترک ملاحوں کی مدد سے یہاں پہنچے تھے۔ اکتوبر ۹۲ میں ترکی اور یونان کے درمیان خاصی سرپھٹول رہی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یونان کے مطابق ۶۸ عراقی پناہ گزین غیر قانونی طور پر ترکی سے یونان کی سمندری حدود میں داخل ہو رہے تھے۔

یونانی نائب وزیرِ خارجہ نے اوائلِ جنوری ۹۳ میں یہ بیان دیا تھا کہ "ان تارکینِ وطن کی تعداد ۵ لاکھ کے قریب ہونے کو ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تعداد یونان کی کل افرادی قوت کا ۶ فیصد ہے جس سے ہمارے معاشی مسائل میں اضافہ ہوگا"۶۔

ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے جب کہ دوسری جانب محض البانوی اور وہ بھی صرف البانوی مسلمانوں کو یونان سے نکالنے کی پالیسی پر انتہائی تیز رفتاری سے عمل جاری ہے۔

آغاز میں یعنی اوائل ۹۳ میں دو ہزار سے زائد البانویوں کو یہ کہہ کر البانیہ میں دھکیل دیا گیا کہ یہ تارکینِ وطن غیر قانونی ہیں اور یونان اپنے اقتصادی مسائل سے نپٹنے کے لیے یہ اقدامات کر رہا ہے۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اقتصادی مسائل سے زیادہ مذہبی تعصب اس پالیسی میں کارفرما تھا جس کا ثبوت بہرحال جون ۹۳ میں واضح طور پر مل گیا۔ ۲۵ جون کو یونانی سرحد سے ملحق البانوی علاقے گائرو کاسترو (Gjirokaster) سے ایک یونانی النسل آرتھوڈوکس عیسائی پادری کو البانوی حکومت نے اس بنیاد پر نکال دیا کہ یہ پادری ملک کے یونانی النسل آرتھوڈوکس عیسائیوں کو علیحدگی پسندی کے رجحانات پر آمادہ کر رہا تھا۔ اس معاملے پر علاقے کی یونانی آبادی اور پولیس کے درمیان جھڑپیں شروع ہو گئیں اور یہ جھڑپیں دوسری جنگِ عظیم کے بعد شدید ترین جھڑپیں تھیں۔ یونان نے اس واقعے کو بنیاد بنا کر اگلے ہی روز محض چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر ایک ہزار البانوی تارکینِ وطن کو گرفتار کر لیا۔ یونانی وزیرِاعظم نے سخت ناراضگی کے عالم میں بیان دیا کہ "پادری کا اخراج ناجائز اور اشتعال انگیز ہے"۔ البانیہ کو دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ وہ ہر ممکن

اقدامات کریں گے۔ وزیراعظم کے بیان کے فوراً بعد ہی البانوی تارکینِ وطن کی گرفتاریوں کا ایک وسیع سلسلہ شروع ہو گیا۔ پہلے سے طے شدہ یونانی وزیرخارجہ' وزیرقومی معیشت اور وزیردفاع کے دورے کی منسوخی کا یونانی حکومت نے اعلان کر دیا۔ ۲۷ جون کو یونانی فوج نے ۶۰ بسوں میں ان تارکینِ وطن کو بھر کر جن میں خواتین' بچے اور قانونی حیثیت کے حامل تین سو افراد بھی شامل تھے' البانوی حدود میں دھکیل دیا۔ ملک سے نکالے جانے سے قبل ان تارکینِ وطن پر تشدد بھی کیا گیا۔ تشدد کے نشانات کی تصدیق خود عالمی ذرائع ابلاغ نے بھی کی۔ ۲۸ جون تک نکالے جانے والے افراد کی تعدا ۲۴۰۰ تک جا پہنچی۔ ۲۹ جون کو ایتھنز میں البانوی سفارت خانے کے باہر پادری کے اخراج کے خلاف ایک شدید مظاہرہ ہوا جس کے بارے میں البانوی وزیرخارجہ نے بیان دیا کہ یہ مظاہرہ حکومتِ یونان نے خود کروایا تھا۔ البانوی صدر صالح بریشا نے یونان سے اپیل کی کہ وہ اپنے فیصلے پر نظرثانی کرے اور اس مسئلے کے حل کے لیے کوششیں کرے۔ لیکن یونان نے ۲۹ جون کو مزید ہزاروں البانوی تارکینِ وطن کو البانیہ میں دھکیل دیا۔ ۳ جولائی کو پھر خواتین' بچوں اور مردوں سے بھری ہوئی ۳۱ بسیں البانوی سرحد پر پہنچیں اور ان تارکینِ وطن کو البانیہ کی حدود میں ہانک دیا۔ ۳ جولائی والے گروپ کے تارکینِ وطن کے پاس محض ان کے کپڑے باقی تھے' مزید کچھ بھی لے جانے کی اجازت نہ دی گئی۔ یونانیوں کے اس غیر مہذب طرزِ عمل پر ان تارکین وطن نے صحافیوں اور کیمرہ مینوں کے سامنے نعرے لگاتے ہوئے دوبارہ یونان میں واپس آجانے کے عزم کا اعادہ کیا۔

۴ جولائی کو روم میں البانوی سفارتخانے کے ایک اعلامیے میں کہا گیا کہ دھکیلے جانے والے ان افراد میں سے بہت سے افراد غیرقانونی حیثیت کے حامل ہرگز نہیں تھے۔ ۳۴۰۰ قانونی حیثیت کے حامل تارکینِ وطن کے ساتھ ہتک آمیز سلوک کیا گیا ہے۔ انہیں ان کے ذاتی سامان' رقم اور روزگار سے محروم کر دیا گیا ہے' اور اعلامیے میں یہ بھی کہا گیا کہ مذکورہ پادری کے اخراج کے بارے میں البانیہ اور یونان (مذاکرات پر) متفق ہو گئے تھے مگر بعد میں یونان نے مبہم طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا۔ ۴ جولائی تک ۲۰ ہزار افراد کو دھکیل دیا گیا تھا۔ ۴ جولائی کو ہی جنوبی البانیہ کے ایک یونانی النسل رہنما نے کہا کہ پولیس سے ہونے والی حالیہ جھڑپوں کے بعد یہ واضح ہو گیا ہے کہ یونان ہی البانیہ میں یونانی النسل قومیت کے تحفظ کو یقینی بنائے گا۔ پولیس نے ہمیں کتوں کی طرح زدوکوب کیا' ہمارے گاؤں نذرِ آتش کرنے کی دھمکی دی۔ یونانی النسل گروہ کی پارٹی ''اومونیا پولیٹیکل آرگنائزیشن'' کے جنرل سیکرٹری نے مزید کہا کہ اگر یونان طاقت کے ذریعے

ہمیں تحفظ نہ دے سکا تو پھر ہمیں اپنی نسل کشی کا خطرہ ہے۔ اسی رہنما نے یونانی فوج کو جنوبی البانیہ پر قبضہ کرنے کی دعوت دی اور یونانی النسل البانوی علاقے کو یونان میں ضم کرنے کا مطالبہ بھی کیا ۸۔

یونانیوں کا ایک اور گروہ یہ اصرار کرتا ہے کہ یونانی صرف انصاف' آزادی' اپنے تمام حقوق اور پھر ان تمام حقوق کی ضمانت چاہتے ہیں۔ البانویوں کا کہنا ہے کہ ان کو یہ سب کچھ حاصل ہے۔ یونانیوں کو پرائمری تعلیمی اداروں میں اپنی زبان کے استعمال کی آزادی حاصل ہے۔ مگر وہ ثانوی اور یونیورسٹی کی سطح تک اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ معاشی عدم مرکزیت' پولیس' فوج اور سول سروس میں مکمل نمائندگی کے خواہاں ہیں۹۔ یونانی النسل گروہ کے مطالبات کو البانوی حکومت علیحدگی پسندانہ رجحانات پر محمول کرتی ہے۔ ان حالات میں بلقان کی صورتِ حال پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے اور عالمی سطح پر مسلم۔ عیسائی تعلقات میں روزبروز کشیدگی بڑھتی جا رہی ہے۔ ان واقعات کو حل کرنے کے لیے دنیا کے مدبرین کو اپنا کردار ادا کرنا چاہیے اور ساتھ ہی مغربی ممالک کو بھی ان احساسات کا ادراک اور خیال کرنا چاہیے جو مسلم دنیا میں پیدا ہو رہے ہیں۔

۱۔ جون ۱۹۹۰ میں البانیہ کے اشتراکی اقتدار کی گرفت کمزور ہونے کے سبب لاکھوں کی تعداد میں البانوی باشندے اٹلی اور یونان کی طرف ہجرت کر گئے تھے۔ یونان پہنچنے والے ان البانوی مہاجرین میں البانیہ کے دونوں بڑے نسلی گروہ یعنی البانوی اور یونانی شامل تھے۔ مذکورہ البانوی پناہ گزینوں سے مراد مسلم البانوی ہیں۔

۲۔ البانوی حکومت یونانی النسل البانویوں کی تعداد ۶۰ ہزار جب کہ یونانی حکومت ڈھائی لاکھ بتاتی ہے۔ مگر یونانی البانوی اپنی ۳ لاکھ آبادی کا دعویٰ کرتے ہیں گویا کل آبادی کا ۹ فیصد' لیکن یہ اعدادوشمار غلط لگتے ہیں۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ البانیہ میں اس متنازعہ گروہ کی تعداد ایک لاکھ ۲۰ ہزار ہے کیونکہ ۱۹۹۲ کے انتخابات میں یونانی النسل گروہ کی پارٹی نے ۵۴ ہزار ووٹ حاصل کیے تھے' یوں اس لحاظ سے یونانی النسل افراد کی کل آبادی ۳.۶۳ فیصد بنتی ہے۔

۳۔ البانوی النسل عیسائی (بہت تھوڑی تعداد میں) یونانی آرتھوڈوکس چرچ کے پیروکار ہیں۔

۴۔ بحوالہ دی نیوز ۵ جولائی ۱۹۹۳۔

۵۔ اشتراکیت کے زوال کے سبب بیروزگاری اور جبر کے نظام سے گلوخلاصی کے لیے ۱۹۹۰ میں البانوی مہاجرین کا اٹلی اور یونان میں ایک سیلاب آگیا تھا۔

۶۔ گارڈین میں شائع شدہ (Helena Smith) کا مراسلہ بحوالہ ڈان ۳۱ جنوری ۱۹۹۳۔

۷۔ یونانی قوم پرست جنوبی البانیہ کو شمالی ایپیرس (Epirus) کہتے ہیں۔ ان کا موقف ہے کہ لندن میں ۱۹۱۲ میں البانوی حدود کے تعین کے وقت یہ علاقہ البانیہ کو دے دیا گیا تھا۔ جب کہ البانوی یہ شکوہ کرتے ہیں کہ ان نقشہ نگاروں نے البانوی دھرتی کو ہمسایہ کوسووہ' مقدونیہ اور مونٹی نیگرو میں تقسیم کر دیا۔

۸۔ دی نیوز ۵ جولائی ۹۳۔ ۹۔ ہفت روزہ گارڈین ۱۱ جولائی ۹۳۔

رسائل و مسائل

انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی

[حالیہ انتخابات میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی اور اس کی تنفیذ' نیز انتخابی مہم کے بارہ میں کئی خطوط موصول ہوئے۔ ان خطوط میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ مثلاً' فرنٹ بنانے کا فیصلہ شوریٰ نے نہیں کیا' یہ فیصلہ صحیح نہ تھا' مہم میں خلافِ شریعت اور پست طور طریقے اختیار کیے گئے' امیرِ جماعت' جماعت کو غلط راہ پر لے جارہے ہیں' حالیہ نتائج کے بعد ان کو اپنے منصب سے استعفیٰ دے دینا چاہیے' نواز شریف سے اتحاد نہ کرکے بینظیر کو برسرِاقتدار لانے کا گناہ جماعت کے سر ہے' اتحاد نہ کرتے مگر مفاہمت نہ کرکے بے تدبیری اور جماعتی فیصلہ کی خلاف ورزی کی گئی۔ اسی طرح بعض خطوط میں ان لوگوں کے خلاف تادیبی کارروائی کا مطالبہ کیا گیا ہے جو نظم و ضبط کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں' تنہا انتخاب لڑنے کی پالیسی کو سراہا گیا ہے' اور آئندہ کبھی اتحادی سیاست نہ کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان سارے خطوط کے جواب میں ایک جامع جواب سب کو بھیج دیا گیا تھا۔ وہی جواب ذیل میں شائع کیا جارہا ہے' تاکہ قارئین کے ذہنوں میں اس قسم کے سوالات ہوں تو شاید کچھ ان کی تشفی کا سامان ہوسکے۔]

میں شکرگزار ہوں کہ آپ نے حالیہ انتخاب میں جماعتِ اسلامی کی پالیسی' اس کی مہم' اور نتائج کے بارہ میں اپنے جذبات و تاثرات اور تجزیہ و تبصرہ سے آگاہ کیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے کہ اس کے دین اور اس دین کے قیام کے لیے کوشاں جماعت سے محبت کی خاطر ہی آپ نے یہ زحمت اٹھائی ہوگی۔

آپ کا حق بنتا ہے کہ میں آپ کو ذاتی طور پر جواب دوں اور میرا بھی یہی دل چاہتا ہے' لیکن ہر مکتوب نگار کو خط لکھنا میرے بس میں نہیں۔ اس لیے میں یہ عمومی خط لکھ رہا ہوں۔

آپ نے جو باتیں لکھی ہیں' میں ان میں سے اکثر کے بارہ میں ماہنامہ ترجمان القرآن میں لکھتا رہا ہوں۔ ان کو دہرانے میں کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ اس لیے میں آپ سے یہ درخواست

کروں گا کہ اب تک نہ دیکھا ہو تو براہِ مہربانی ان کو دیکھ لیں، اور پڑھ چکے ہوں تو ایک نظر دوبارہ ڈال لیں۔ انتخابات کے نتائج کے بعد کی صورتِ حال پر نومبر ۹۳ کے شمارہ میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ اسلامک فرنٹ جیسی کسی تنظیم کی ضرورت پر دلائل فروری ۹۳ کے شمارہ میں دیے گئے تھے۔ فرنٹ کے قیام کے بعد، جولائی ۹۳ میں اس بارہ میں پیش کیے جانے والے بعض اہم سوالات و شبہات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ اور ستمبر ۹۳ میں کسی کے پیچھے نہ لگنے اور علیحدہ اپنے پلیٹ فارم سے انتخابات میں حصہ لینے کی پالیسی پر بحث کی گئی تھی۔ اس پالیسی کو اصولاً "(تفصیلات و تنفیذ کے پہلو سے نہیں)، ماضی سے تسلسل کے تناظر میں دیکھنا ہو تو جنوری ۹۳ کے شمارہ میں سیّد مودودیؒ کے افکار "جماعتِ اسلامی: حکمت عملی اور لائحہ عمل" کے عنوان سے، اور برادر محترم نعیم صدیقی صاحب کی تحریر "اسلامی تحریک کے مراحل دورِ حاضر میں" ضرور دیکھ لیجیے۔

یہ سب چیزیں پڑھنے کے بعد بھی یقیناً بعض امور میں آپ کا اختلاف اسی شدت کے ساتھ قائم رہے گا، بلکہ کہیں شاید یہ زیادہ شدید ہو جائے۔ بعض دلائل سے آپ کو اختلاف ہوگا، کچھ نئے اختلافات و دلائل بھی آپ کے ذہن میں پیدا ہوں گے، اور بعض امور میں آپ کی تشفّی نہ ہوگی اور آپ کا عدم اطمینان برقرار رہے گا، شاید بعض امور میں کچھ اطمینان و اتفاق کا سامان بھی ہو جائے۔ مجھے اس پر کوئی تعجب یا مایوسی نہ ہوگی کیونکہ ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے، اور ہوتا رہے گا۔ اگر بحث و تمحیص اور استدلال سے ہمیشہ اتفاقِ رائے پیدا ہوا کرتا تو دنیا جنت ہوتی اور یہاں سلاماً" سلاما" کا راج ہوتا، جو وہ نہیں ہے اور نہ بن سکتی ہے۔ انسانوں کو اختلاف سے مفر نہیں، اختلافات کے باوجود ساتھ رہنا نہ آتا ہو تو گھر بچ سکتا ہے نہ اجتماعیت۔

اجتماعیت اور اختلافات کے آداب اور حل کے طریقوں کے بارہ میں آپ نومبر ۹۳ کے شمارہ میں حکمتِ مودودیؒ، محترم نعیم صدیقی صاحب کی تحریر "اسلامی نظمِ جماعت" اور اکتوبر ۹۲ کے اشارات میں ضروری رہنمائی پا سکتے ہیں۔

مجھے کسی فیصلہ یا رائے سے اختلاف ہوتا ہے، تو عرصہ سے چند اصولوں کی پابندی کی کوشش کرتا رہا ہوں۔ اگرچہ یہ دعویٰ نہیں کہ ہمیشہ کامیاب ہوتا ہوں، کیونکہ میرے ساتھ بھی شیطان لگایا گیا ہے، اور میں نسیان و خطا سے پاک نہیں ہو سکتا۔ آپ بھی غور کریں کہ جب اختلاف سے مفر نہیں، تو اسی قسم کے اصولوں ہی سے اتحاد کی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

۱۔ جس رائے یا موقف کے بارہ میں اپنے علم و فہم کے مطابق اطمینان ہو اس کو صحیح

سمجھنا' اس پر قائم رہنا' اور شرعی حدود کے اندر اس کو کہنا اور لکھنا آدمی اپنا حق سمجھے' خواہ وہ کسی بھی اجتماعیت یا شخصیت کی رائے یا فیصلہ کے خلاف ہو۔ مگر ہمیشہ اپنے غلط ہونے' اور دوسری رائے کے صحیح ہونے کے امکان کو تسلیم کرے۔

۲ ۔ جس چیز کے بارہ میں اطمینان ہو کہ غلط ہے' اس کو غلط سمجھنا اور حدود کے اندر غلط کہنا اور لکھنا بھی اپنا حق سمجھے' خواہ وہ کسی اجتماعیت یا شخصیت کا فیصلہ اور رائے ہو۔ مگر اس کے صحیح ہونے' اور اپنے اختلاف کے غلط ہونے کے امکان کو بھی تسلیم کرے۔

ان دو رویوں سے اختلافات میں بڑی رواداری اور نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔

۳ ۔ اختلاف کی صورت میں' الفاظ میں' لب و لہجہ میں' انداز میں' اظہار میں تلخی اور درشتگی سے بچے' اور نرمی اختیار کرے' نیت پر حملہ نہ کرے' بلا تحقیق اور جو ثابت نہ کر سکے وہ الزام نہ لگائے' اور فی الجملہ گفتگو اور باہمی تعلقات میں احکامِ الٰہی اور عدل کی پابندی' اور حسن و احسان کا التزام کرے۔

۴ ۔ جب سمجھے کہ امیر نے بھی غلط فیصلہ کیا ہے' شوریٰ نے بھی' اور میری رائے صحیح ہے' تب بھی یہ تسلیم کرے کہ اجتماعیت میں مستند اداروں کے فیصلے نافذ ہونے چاہئیں کہ اسی سے اجتماعیت قائم رہ سکتی ہے۔ جو فیصلے اس کی دانست میں غلط ہوں' اگر ان کو تبدیل کرانے میں کامیابی نہ ہو' اور وہ بالکل ناقابلِ برداشت ہوں' تو صبر اور خاموشی اختیار کرے' اس کے خلاف عمل نہ کرے' اور ان کی تنفیذ کا منصب حاصل ہو تو وہ چھوڑ دے۔

حالیہ واقعات میں آپ کا اختلاف کتنا ہی شدید ہو' درج بالا اصولوں اور تحریروں کی روشنی میں اپنی روش اور اندازِ اختلاف پر خود ہی غور کر لیں۔ کہیں کوئی کوتاہی پائیں تو استغفار ہر چیز کا علاج ہے۔

آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس سلسلہ میں آپ درج ذیل امور پر غور کریں۔

۱ ۔ پالیسی کے تمام فیصلے --- فرنٹ کا قیام اور اس کے ذریعہ انتخابات میں شرکت ہو یا پاسبان کا قیام --- عاملہ اور شوریٰ نے کیے ہیں' اس سے بحث نہیں کہ وہ صحیح ہیں یا غلط۔ ان اداروں کی روداد لکھی جاتی ہے' اگلے اجلاس میں پڑھی جاتی ہے اور اس کی توثیق کی جاتی ہے۔ کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ادارے تو احتجاج نہ کریں اور توثیق کر دیں' اور آپ چند افراد کے اس پروپیگنڈہ سے ذہنی انتشار کے شکار ہو جائیں کہ شوریٰ اور عاملہ نے یہ فیصلے نہیں کیے؟ ۱۹۴۱ سے آج تک بے شمار اختلافات رہے ہیں' مگر یہی ادارے سارے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ پھر آج

ان فیصلوں کو کیوں مشکوک بنایا جا رہا ہے؟ آپ انتشار میں مبتلا ہونے کے بجائے اس پروپیگنڈہ کے مقابلہ میں کھڑے کیوں نہیں ہو جاتے؟ قرآن نے یہی ہدایت دی ہے کہ لوگوں کے کہنے سے متزلزل اور منتشر نہ ہو، قدم نہ ڈگمگائیں، "اپنے" بارہ میں حسن ظنِ رکھو، "اپنے" اوپر طعن نہ کرو، اور "کہہ دو ہم سے یہ نہ ہو گا کہ ایسی باتیں کریں۔ سُبْحَانَكَ هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ" ("اپنے" میں ہم اور آپ سب شامل ہیں)۔

۲ - دینی و اخلاقی طور پر یقیناً کئی غلطیوں کا ارتکاب ہوا ہے۔ مجلسِ شوریٰ نے بھی ان کی نشان دہی کر دی ہے۔ اس پر ہم سب کو استغفار کرنا چاہیے، کرنے والوں کو بھی اور نہ کرنے والوں کو بھی، اپنے لیے بھی اور اپنے بھائی بہنوں کے لیے بھی۔ اور اصلاح کی کوشش بھی۔

۳ - آپ نے بعض افراد یا مہم کے بارہ میں باقی جن امور کی نشان دہی کی ہے، ان میں سے بعض صحیح ہیں اور بعض غلط فہمی یا غلط اطلاع پر مبنی۔ آپ غور کریں گے تو جو باتیں آپ نے کہی ہیں ان میں سے بعض آپ ثابت نہیں کر سکتے۔ پھر آپ ایسی باتیں کیوں زبان و قلم پر لائیں؟

۴ - امیرِ جماعت کے بارہ میں آپ نے جو باتیں لکھی ہیں، اور ان پر جو الزامات لگائے ہیں، اگر وہ سب صحیح ہیں، تو پھر کیا اصل نقص اس نظامِ جماعت میں نہیں ہے جس نے ایسا آدمی اوپر تک پہنچا دیا، اور اب بھی اوپر ہی رکھنا چاہتا ہے؟

۵ - امیرِ جماعت سے استعفیٰ کے مطالبہ میں مغربی جمہوری ممالک کی مثالیں دینا صحیح نہیں، اس لیے کہ وہاں کوئی ایسی روایت نہیں۔ ہر انتخاب میں ایک پارٹی جیتتی ہے۔ ہر انتخاب کے بعد ہارنے والی پارٹی کا لیڈر مستعفی نہیں ہو جایا کرتا۔ وہ اس وقت مستعفی ہوتا ہے جب وہ سمجھتا ہے کہ اب میری قیادت میں پارٹی کے جیتنے کا امکان ختم ہو گیا ہے۔ مزید یہ کہ ان جماعتوں کی طرح جماعت کا مقصدِ وحید صرف انتخابات کے ذریعہ برسرِ اقتدار آنا نہیں۔ پھر آپ یہ بھی غور کریں کہ دستور میں امیرِ جماعت کو ہٹانے کا ایک طریقِ کار طے کر دیا گیا ہے۔ اس کے برخلاف مطالبوں سے امیر کو ہٹانا کیا دستور کی خلاف ورزی نہیں ؟

۶ - پیپلزپارٹی کو دوبارہ برسرِاقتدار لانے کی اصل ذمہ داری انہی پر عائد ہوتی ہے جن کو ہم جان لڑا کر اسی مقصد کے لیے برسرِاقتدار لائے تھے کہ پیپلزپارٹی سے چھٹکارا مل جائے۔ اس لیے کیا یہ صحیح نہ ہوگا کہ اس کا الزام "اپنے" سر ڈالنے اور "اپنے" اوپر زبانِ طعن دراز کرنے کے بجائے ان ہی سے جواب طلب کریں۔

۷ - آپ نتائج سے دل شکستہ اور پریشان ہیں' ہم بھی ہیں۔ لیکن یقیناً آپ اتفاق کریں گے کہ فرنٹ نہ ہوتا' پاسبان نہ ہوتا' مہم منکرات اور غیر ثقہ حرکات سے بالکل پاک ہوتی' جماعت تنہا انتخاب لڑتی' جب بھی نتائج کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتے۔ پھر کیا اسباب' گہرائی میں جاکر' اپنے ایمان و اخلاق' اپنے ۵۲ سالہ دعوتی کام اور اپنی تدابیر اور حکمتِ عملی میں تلاش کرنا ضروری نہیں ؟

۸ - ایمانی و اخلاقی اسباب کے بعد' ہارنے کا اصل سبب تو یہ ہے کہ ہم ۵۲ سال میں اپنی دعوت سے آبادی کے ایک بڑے حصے کو روشناس تک نہیں کرسکے ہیں' کجا یہ کہ متاثر کرلیتے۔ اور جن کو متاثر کرسکے ان کو اپنے ساتھ لے کر چلنے میں کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ جس طرح ہم اپنی دعوت دلوں میں نہیں اتار سکے ہیں' جس طرح ہم ۲۳ سال میں پیپلزپارٹی کے ووٹروں کو یہ سمجھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں کہ وہ غدار' ملک دشمن' مخالفِ اسلام اور نسوانی قیادت کے تحت ہے' اسی طرح ہم ۱۰۰ دن میں اپنے دیرینہ حمایتیوں تک کو یہ بات بھی سمجھانے میں کامیاب نہیں ہوسکے کہ' جہاں تک ملک کی بڑی اندرونی و بیرونی پالیسیوں کا تعلق ہے' ملک میں اسلام کے مستقبل کا تعلق ہے' عوام کی قسمت جاگنے کا تعلق ہے' ظلم کے خاتمہ کا تعلق ہے' بینظیر اور نواز شریف میں کوئی بڑا فرق نہیں ہے۔

۹ - نواز شریف یا بینظیر سے اتحاد و مفاہمت کریں یا نہ کریں' یا کسی اور سے' یہ تدبیری امور ہیں۔ تدبیری امور میں یہ بات یاد رکھیے کہ جس چیز سے اللہ نے منع نہیں کیا' اس کو اپنے اوپر حرام کرلینا اپنے آپ کو خواہ مخواہ "حرج" میں ڈالنا ہے۔ پھر بند گلی سے نکلنے کا راستہ نہیں ملتا۔ اپنے کو آزاد رکھیے۔ ہر وہ تدبیر اختیار کرنے کے لیے تیار رہیے جس سے اپنے مقصد کی طرف پیش رفت ہو' اِلّا یہ کہ وہ خلافِ اسلام ہو۔

۱۰ - جماعت میں جو افراد نظم و ضبط کی خلاف ورزی کے مرتکب ہوئے ہیں ان کے خلاف کارروائی اس طرح ناگزیر نہیں جس طرح حدودِ الٰہی کا نفاذ۔ کارروائی کرنا یا نہ کرنا' یہ جماعتی مصالح پر منحصر ہے۔ اور اس وقت فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ پر کاربند رہنے ہی میں تحریک کی بھلائی محسوس ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فتنہ پھیلنے کے اندیشہ سے عبداللہ بن ابی جیسے منافق سے بھی درگزر فرمایا' اور شرکتِ بدر کی فضیلت کی وجہ سے حاطبؓ کی خطا بھی معاف فرما دی' بزرگوں کی حد تک وہی روش صحیح ہے جو ہم مشاجراتِ صحابہ کے ضمن میں اختیار کرتے ہیں' یعنی خاموشی' اور ان کو اجتہادی غلطی پر مبنی سمجھنا۔ وہ اپنی دانست میں یہ

سب کچھ اخلاص کے ساتھ اور جماعت کو بچانے کے لیے کررہے ہیں۔ آپ بزرگوں کے بارے میں یہ دو دعائیں مانگتے رہیں۔

(۱) رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ

(۲) رَبَّنَا اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

میری ساری گزارشات پر، ما قبل تحریرات پر بھی اور اس خط پر بھی' آپ غور کرلیں۔ امید ہے کہ آپ اطمینان محسوس کریں گے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور ہمیں سب کو اقامتِ دین کی اس جدوجہد میں ساتھ چلنے اور اپنا حصہ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے جسے ہم نے اپنے مقصدِ زندگی کی حیثیت سے اپنایا ہے۔ (خ-م)

مرکزی شوریٰ کے حالیہ فیصلے

مرکزی مجلسِ شوریٰ کے اجلاس منعقدہ ۱۶ - ۱۹ اکتوبر ۱۹۹۳ کے فیصلوں کے بارہ میں پہلے ایک سرکلر جاری ہوا۔ یہ فیصلہ پاسبان' اسلامک فرنٹ اور انتخابی مہم میں خلافِ شریعت حرکات جیسے اہم مسائل کے بارے میں تھے۔ سرکلر جاری ہوتے ہی اراکینِ شوریٰ نے یہ کہا کہ سرکلر میں درج شدہ فیصلے ان فیصلوں کے خلاف ہیں۔ جو مجلسِ شوریٰ نے کیے تھے۔ خصوصاً پاسبان کے بارہ میں کہا گیا کہ اس کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ پھر ایک دوسرا سرکلر جاری ہوا۔ اس میں بھی پاسبان ختم کرنے کا کوئی فیصلہ نہیں' لیکن بعض ارکانِ شوریٰ کی طرف سے مسلسل یہی کہا جارہا ہے کہ مجلسِ شوریٰ کا اتفاقِ رائے اسی بات پر تھا کہ پاسبان کو ختم کردیا جائے۔ یہی فیصلہ کی روح ہے۔ ان باتوں سے بڑا ذہنی انتشار پیدا ہورہا ہے۔ امید ہے آپ صحیح صورتحال واضح فرمائیں گے۔

مرکزی مجلسِ شوریٰ میں فیصلے کرنے کا جو طریقہ رائج ہے وہ یہ ہے کہ اوّل زیرِ بحث مسئلہ پر ارکانِ شوریٰ اظہارِ خیال کرتے ہیں۔ ان کے بعد امیرِ جماعت' ان کی بحث کی روشنی میں' بحث کو سمیٹ دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ کارروائی میں درج ہوتا ہے۔ ماضی میں بعض متنازعہ صورتیں پیدا ہونے کی وجہ سے' اور اس بار پھر اہم متنازعہ امور کے زیرِ بحث ہونے کی وجہ سے' طے کیا گیا کہ اب فیصلے باقاعدہ لکھے جائیں گے' انھیں شوریٰ کے سامنے پڑھ کر سنایا جائے گا' اور ان کی منظوری کے بعد وہی شوریٰ کے فیصلے قرار پائیں گے۔ چنانچہ اس طریقِ کار کے مطابق ہر اہم فیصلہ لکھا گیا' اور شوریٰ نے اسے باقاعدہ منظور کیا۔

مثال کے طور پر پاسبان کا مسئلہ ہی لیجیے۔ پہلے سرکلر کے الفاظ تحریری فیصلوں سے کچھ مختلف ہوگئے تھے۔ یہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ لیکن فوراً ہی دوسرا سرکلر جاری ہوگیا تھا' جو تحریری فیصلوں پر مشتمل تھا۔ آپ دونوں کا بغور مطالعہ کریں تو آپ خود ہی اس نتیجہ تک پہنچ جائیں گے کہ الفاظ میں فرق کے باوجود دونوں سرکلروں میں درج فیصلوں میں کوئی جوہری فرق نہیں۔ شوریٰ کے باقاعدہ تحریری فیصلے میں بھی پاسبان کو ختم کردینے کا کوئی فیصلہ شامل نہیں۔ دوسرے سرکلر میں جو فیصلہ دیا گیا ہے اسے لکھ کر شوریٰ کے سامنے پیش کیا گیا تھا' اور ساری بحث ختم ہونے کے بعد کیا گیا تھا۔ شوریٰ کے سامنے اس سلسلہ میں ایک مختلف فیصلہ کا متن بھی تھا' جو اس کے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ منظورشدہ فیصلہ دو بار پڑھا گیا' اس کی تشریح بھی کی گئی' اور اس کے بعد شوریٰ نے متفقہ طور پر اسے منظور کیا۔

آپ اس فیصلہ کے الفاظ پر غور کریں تو ایک معمولی سمجھ والا آدمی بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شوریٰ نے پاسبان کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اگر ایسا فیصلہ ہوتا تو اس کے لیے تو ایک جملہ کافی ہوتا۔ اگر پاسبان کو ختم کردیا گیا تھا' تو آخر شوریٰ نے ضلعی نظم کے حوالے کس پاسبان کا نظم کیا' اور مرکزی ناظم شعبہ نوجوانان کے سپرد کس پاسبان کا کام کیا۔ ہاں' یہ بات صحیح ہے کہ کوئی ضلعی نظم اگر پاسبان کا نظم قائم کرنا نہ چاہے' یا ختم کرنا چاہے' تو دستور کے قواعد و ضوابط کا لحاظ رکھتے ہوئے' وہ ایسا کرسکتا ہے۔ تحریری فیصلہ کے بعد بھی اگر کوئی شوریٰ کے اتفاقِ رائے اور اس کی بحث کی روح کی بات کرے' تو پھر آخر کوئی بات کس طرح طے ہوسکتی ہے۔ (خ - م)

مطبوعات

دخل در معقولات : از ارشد میر (مرحوم)۔ ناشر ادارۂ فروغ اردو' لاہور۔ صفحات ۱۷۶۔ قیمت ۵۰ روپے۔

پہلے فلیپ پر شفیق الرحمٰن اور اشفاق احمد کے زمردیں الفاظ' آخری فلیپ پر ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور مشفق خواجہ کے یاقوت پاروں سے مرتب جملے۔ مولف کے اپنے صفحات کے علاوہ سید ضمیر جعفری کا "حرفے چند"۔

بہرحال پہلے ہم ایک راسخ عرفانی مرحوم نعت نگار ہی کو جانتے تھے کہ گوجرانوالہ یہی ہے۔ اب پتا چلا کہ مرحوم کے بعد (اور زندگی میں بھی) ایک صاحبِ "دخل درمعقولات" بھی موجود تھے۔ اور اب وہی گوجرانوالہ کی شناخت رہ گئے تھے۔ (افسوس کہ یہ تبصرہ آتے آتے وہ بھی رخصت ہوگئے)۔

ان کی کتاب طنز و مزاح پر مشتمل ہے اور اس قتل و اغوا اور ڈاکوں کے دور میں ارشد میر انسانی عزم و ہمت کو اکسانے کے لیے خندہ و تبسم کے سامان لے کر آئے ہیں اور یہ ایسا جادوئی سامان ہے کہ عین چتا پر بیٹھا ہوا انسان بھی شعلوں کی آنچ بھول کر ہنسنے لگتا ہے اور اگر اللہ کی طرف سے آئی ہو تو ہنستے ہنستے ہی اس کا کام تمام ہو جاتا ہے۔ ہم سب کام تمام ہو جانے ہی کے انتظار میں ہیں۔ اس میں آخر ارشد میر کا کیا قصور' وہ ایسے معقولات میں دخل نہیں دیتے۔

کتاب کو میں نے ایک مرتبہ تو بوقتِ ورود پڑھا' اور اب پھر یاد تازہ کرنے کے لیے اس کے مضامین پر نظر ڈالی۔

مختصراً یہ کہتا ہوں کہ نہایت سادہ معاملات اور معمولی اشیا سے طنز و مزاح کے ایسے پھول کھلائے گئے ہیں کہ جن کے ساتھ کوئی کانٹا نہیں ہے۔ بس رنگ ہی رنگ اور نکہت ہی نکہت ہے۔ آدم بگاڑ تہذیب نے اس دور میں جو کوڑھ اور طاعون پھیلا دیے ہیں' ان سے بچاؤ کے لیے

ارشد میر صاحب کا نسخہ بہت کارگر ہے۔ آنسوؤں اور کراہوں اور آہوں کے مریضوں کے ہسپتال میں ان کی خدمات کی بڑی ضرورت ہے۔ (ن - ص)

اقامتہ الصلوٰۃ از ڈاکٹر خالد علوی۔ ناشر: انسٹیٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز برمنگھم (برطانیہ)۔ پاکستان میں ملنے کا پتا: ادارہ ادب اسلامی' وحدت روڈ' لاہور۔ قیمت درج نہیں۔ صفحات ۳۱۰۔

ڈاکٹر خالد علوی پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات سے وابستہ رہے ہیں۔ ان دنوں برطانیہ میں مقیم ہیں۔ سیرتِ پاکؐ پر ان کی کتاب "انسانِ کامل" ایک مقام رکھتی ہے۔ مزید دس بارہ دینی و علمی موضوعات پر وہ اپنے رشحاتِ قلم پیش کرچکے ہیں۔

نماز کے موضوع پر کئی کتابیں شائع ہوئیں اور نظر سے گزریں۔ اچھے اچھے علما نے اپنے اپنے نقطہ نظر سے لکھا' لیکن ڈاکٹر خالد علوی نے اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ جس نماز میں خدا اور رسولؐ نے وحدت واخوت قائم کرنے کی صفت رکھی تھی اسے موجودہ دور کے فقہی تفرقہ پردازوں نے مذہبی تصادموں اور مساجد میں ہنگامہ آرائی کا ذریعہ بنا دیا' اسے وہ کسی خاص گروہ کے مسلک کے تحت نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں اس طرح پیش کریں گے کہ اہلسنّت کے تمام مکاتبِ فکر کو پیشِ نظر رکھ کر سب کے لیے قابلِ قبول انداز سے رقم کریں گے۔ پھر اس میں اس بات کا بھی پورا لحاظ رکھا کہ ہر بات حوالوں کے ساتھ پیش کریں گے۔

نماز کی رہنمائی کے لیے جتنی بھی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ بالعموم ان کی ترتیب فقہی تقاضوں کے مطابق ہے۔ حالانکہ اس دور میں دعوتی ضروریات کے لیے ایک نئی ترتیب کی ضرورت ہے۔ یعنی پورے سلسلہ دین میں نماز کی حیثیت دوسری عبادات سے اس کا تعلق' نماز کے روحانی و اخلاقی اوصاف' پھر نماز کے اندر پڑھے جانے والے الفاظ کے مفہوم کے ساتھ مختلف ارکان و حرکات کی حکیمانہ معنویت' اس سلسلے کو مکمل کرنے کے لیے بعض متعلقہ مسائل' تعدیلِ ارکان' رکوع' سجود اور قعدہ و قیام کی مطلوبہ شکل' اور ضرورت ہو تو رائج العام اور بعد دلیل غلطیوں کی نشاندہی۔ نماز کے دوران میں ایک ہی عمل کے متعلق سنت سے ثابت ہونے والے مختلف مسائل کو (اگر فی نفسہٖ کسی کی تنسیخ عمل میں نہ آئی ہو) شریعت کے توسع پسندانہ مزاج کی دلیل سمجھا جائے۔ طہارت کا باب سب سے آخر میں رکھا جائے۔ تاکہ کسی غیر مسلم یا اسلام نا آشنا مسلم نوجوانوں کو اصل موضوع سے قبل چھوٹے چھوٹے مسائل میں الجھن نہ پیش آئے۔ ڈاکٹر صاحب ایسا کرتے تو اچھا تھا۔ مگر یہ صرف میری ذاتی رائے ہے۔ اصرار نہیں۔ (ن - ص)

مسافرانِ راہِ وفا (حصہ اوّل) : از حافظ محمد ادریس۔ ناشر: مکتبہ احیائے دین' منصورہ' لاہور۔ صفحات ۲۲۸۔ قیمت ۴۸ روپے۔

مصنف نے زیرِ نظر مضامین کی صورت میں ایسے تیس دوستوں' عزیزوں اور بزرگوں (مرد و زن) کی یاد تازہ کی ہے جو کسی نہ کسی حیثیت سے تحریکِ اسلامی سے وابستہ رہے۔ ان میں مولانا معین الدین خٹک' مولانا گلزار احمد مظاہری' سیّد اسعد گیلانی' مولانا جان محمد بھٹو' چودھری غلام جیلانی' جناب افضل حسین جیسے معروف اکابر بھی ہیں اور انعام اللہ خان' سہیل حنیف اور ظل الرحمٰن وغیرہم جیسے نوجوان شہدا بھی --- یہ مضامین' جنہیں خاکے یا شخصیے بھی کہا جاسکتا ہے' مفارقت سے پیدا ہونے والے بے ساختہ تاثرات و احساسات پر مبنی ہیں۔ مرحومین کے ساتھ گزرے ہوئے لمحوں کی یادیں اور رودادیں بھی اور کہیں سوانحی معلومات بھی آگئی ہیں۔ (مگر بعض کی تاریخ ہائے وفات کا پتہ نہیں چلتا' یہ بہت ضروری تھا)۔

یہ مجموعہ دلچسپ ہے اور موعظت و سبق آموزی کے نقطۂ نظر سے بھی لائقِ مطالعہ۔ مصنف کے پرخلوص اور دل نشین اسلوب سے قاری تحریر میں جذب ہو جاتا ہے۔ کہیں کہیں اشعار کا برمحل استعمال' مصنف کے عمدہ شعری و ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے۔

ایک دلچسپ بات (جس کی طرف دیباچہ نگار جناب خرم مراد نے بھی اشارہ کیا) یہ ہے کہ ان مضامین میں مصنف کی ''خودنوشت'' کا ایک پہلو بھی موجود ہے۔ کتاب سے مصنف کی اپنی ذات اور شخصیت کے بہت سے گوشے وا ہوتے ہیں' جو ''ہم سب کے لیے باعثِ رشک ہیں۔'' قاری تیس افراد و اشخاص کے ساتھ حافظ صاحب کے بارے میں بھی بہت کچھ جان لیتا ہے۔

تحریکِ اسلامی کے وابستگان پر بہت کم' بہت ہی کم لکھا گیا ہے' حالانکہ بعض اصحاب اپنی علمیت' تقویٰ اور دینی و تحریکی کارناموں کی بنا پر اس لائق ہیں کہ ان کے اعمالِ حسنہ کو تازہ کرنے کے لیے ان پر کتابیں لکھی جائیں۔ اس اعتبار سے حافظ صاحب کے زیرِ نظر مضامین ''فرضِ کفایہ'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ امید ہے' آئندہ بھی وہ یہ مفید سلسلہ جاری رکھیں گے۔ (ر - ہ)

مسلم امہ پر قوم پرستی کے اثرات (دورِ بنو امیہ سے لے کر سقوطِ ڈھاکہ تک) : از پروفیسر عبدالخالق سہرانی بلوچ۔ ناشر: مکتبہ اصلاحِ ملت' کندھ کوٹ' ضلع جیکب آباد۔ صفحات ۱۵۲۔ قیمت ۴۰ روپے۔

مصنف کے خیال میں "قوم پرستی" کا مہلک زہر ہی مسلمانوں کے زوال و انحطاط میں بنیادی طور پر کارفرما رہا ہے' اور "قوم پرستی" سیاسی محرومی' معاشی ناانصافی اور قومی برتری سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر اسلام کا نظامِ عدل اور حریت و مساوات قائم نہ ہوا' اختیارات و اقتدار پر اللہ کے نیک بندوں کے بجائے نااہل اور مفاد پرست لوگ قابض رہے اور افرادِ امّت سیاسی' معاشی اور اخلاقی استحصال کا شکار رہے تو سقوطِ بغداد' سقوطِ غرناطہ' سقوطِ فلسطین اور سقوطِ ڈھاکہ جیسے المیے آئندہ بھی رونما ہوتے رہیں گے۔ (ادارہ)

منصوبہ بلا سود عوامی بینکاری : از سعید الحسن۔ ملنے کا پتا : کوارٹر ۲ سی نائن۔ سیکٹر ۴' جی ۸' نی اینڈنی کالونی' اسلام آباد۔ صفحات ۴۸۔ قیمت ۱۰ روپے۔

مصنف نے اپنی مدد آپ کی بنیاد پر معاشی نظام کو سود سے پاک کرنے کا ایک منصوبہ پیش کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ ابتدائی مرحلے میں بلا سود سرمایہ کاری کی مہم چلا کر بلا سود بینک کا قیام عمل میں لانے کی ضرورت ہے' اس کے نتیجے میں غیر سودی معاشی کاروبار کے ایسے معیاری نمونے سامنے آئیں گے کہ مکمل غیر سودی معاشی نظام کی منزل تک پہنچنا آسان ہوگا۔ مصنف نے عمر بھر حسابات و شماریات کے شعبوں میں ملازمت کی ہے اور یہ منصوبہ' بظاہر ماہرانہ انداز میں مرتب کیا گیا ہے' اس اعتبار سے یہ ماہرین کی توجہ چاہتا ہے۔ انتساب پروفیسر خورشید احمد کے نام ہے۔ (ادارہ)

مرادِ مصطفیؐ : از نقش ہاشمی۔ ناشر: شہنام ادب اکیڈمی' ہاشمی لاج' مریدکے۔ صفحات ۹۶۔ قیمت ۶۰ روپے۔

جناب نقش ہاشمی ایک کہنہ مشق شاعر ہیں۔ ان کی متعدد شعری نگارشات چھپ چکی ہیں۔ زیرِ نظر کتاب سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کی منظوم سوانح ہے۔ مولانا شبلی کی "الفاروق" اس کا اوّلین محرک بنی۔ بعد ازاں انہوں نے سیرتِ عمرؓ پر بیسیوں کتابیں پڑھ کر حیاتِ فاروقؓ کے تابندہ نقوش کو شعری پیکر میں ڈھالا۔ یہ پر خلوص کاوش لائقِ تحسین ہے۔ (ادارہ)

قرآن کا عائلی قانون : از ڈاکٹر حافظ احسان الحق۔ ناشر: ادارہ معارف اسلامی' ڈی ۳۵' بلاک ۵' فیڈرل بی ایریا' کراچی ۷۵۹۵۰۔ صفحات ۱۰۰۔ قیمت ۳۰ روپے۔

قرآنِ حکیم کے عائلی احکامات (نکاح' مہر' طلاق' عدت' نان و نفقہ' ایلا' ظہار' زنا' قذف' وصیت' وراثت) سے متعلق آیات کے متن' اردو اور انگریزی ترجمے اور مختصر تشریح پر مشتمل یہ کتاب ایم اے اسلامیات اور قانون کے نصاب کے مطابق مرتب کی گئی ہے۔ مصنف نے ترجمہ و تشریح میں دورِ حاضر کی معروف تفاسیر سے مدد لی ہے۔ آخر میں منتخب آیات کی لغات اور مختصر عربی قواعد شامل ہیں۔ (ادارہ)

اوج' قراردادِ پاکستان گولڈن جوبلی نمبر: مدیرِ اعلیٰ: ڈاکٹر آفتاب احمد نقوی۔ علمی و ادبی مجلہ گورنمنٹ کالج راوی روڈ شاہدرہ لاہور۔ صفحات ۶۳۲۔

تحریکِ پاکستان' قیامِ پاکستان کی جدوجہد' قائداعظم' اکابرِ مسلم لیگ اور قراردادِ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر نظم و نثر کا یہ مفید مجموعہ محنت و کاوش سے مرتب کیا گیا ہے۔ اس میں متعدد نوادر بھی شامل ہیں۔ اپنے موضوع پر یہ ایک لائقِ مطالعہ دستاویز ہے۔ (ادارہ)

موصولہ مطبوعات

تنویر الآفاق فی مسئلۃ الطلاق: از مولانا محمد رئیس نوری۔ ناشر: ادارہ البحوث الاسلامی جامعہ سلفیہ' بنارس۔ صفحات ۵۱۶۔ قیمت درج نہیں۔

امیر کبیر سیّد علی ہمدانی' حالات و افکار و اوراد: مرتبہ ڈاکٹر حافظ احسان الحق۔ ناشر: ادارہ معارفِ اسلامی' کراچی۔ صفحات ۹۵۔ قیمت درج نہیں۔

قبر پرستی' ایک حقیقت پسندانہ جائزہ: از حافظ صلاح الدین یوسف۔ ناشر: دارالدعوۃ السلفیہ' شیش محل روڈ لاہور۔ صفحات ۲۱۰۔ قیمت درج نہیں۔

محمود غزنوی: از ڈاکٹر عبدالمغنی۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی۔ صفحات ۶۳۔ قیمت ۶ روپے۔

شمعِ طریقت: از مولانا محمد جیلانی صدیقی قدیری۔ ناشر: ولی اکیڈمی' کورنگی' کراچی۔ صفحات ۳۰۰۔ قیمت ۵۰ روپے۔

کھٹے میٹھے انار (ادبی مزاحیہ مضامین) : از شاہ محی الحق فاروقی۔ ملنے کا پتا : ۵' اے ۔ ب ۔ ۱۴/۶ ناظم آباد' کراچی۔ صفحات ۱۸۳۔ قیمت ۱۰۰ روپے۔

تذکرہ' شیخ عبدالنبی شامی نقشبندی : از محمد سلیم شامی۔ ملنے کا پتا : آستانہ شامی' ۲۴۴ جی گلشن راوی' لاہور۔ صفحات ۵۰۶۔ قیمت درج نہیں۔

مسلم ورلڈ آرڈر : از ڈاکٹر فائقہ اسلم ۔ ناشر الجمعیت پبلی کیشنز کراچی۔ صفحات ۳۲ قیمت ۴ روپے۔

Correct and Incorrect English : از مظہر علی ادیب۔ ناشر: نگا گرافکس ۳۵' سوک سنٹر' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔ صفحات ۱۰۳۔ قیمت ۲۰ روپے۔

کمیونزم اور مذہب : از ڈاکٹر طارق جمی' ترجمہ : ڈاکٹر عبدالوہاب حجازی۔ ناشر : ادارہ البحوث الاسلامی' جامعہ سلفیہ' بنارس۔ صفحات ۱۴۸۔ قیمت درج نہیں۔

مجلہ "القلم" : مدیر : ڈاکٹر جمیلہ شوکت۔ ادارہ علوم اسلامیہ' پنجاب یونیورسٹی' لاہور۔ صفحات ۲۲۴۔ قیمت درج نہیں۔

کشکولِ معرفت (قاضی محمد زاہد الحسینی کے مکاتیب) : مرتب عبدالقیوم حقانی۔ ناشر : موتمر المصنفین' اکوڑہ خٹک۔ صفحات ۱۰۵۔ قیمت ۲۴ روپے۔

مسکراتے پھول (بچوں کے لیے نظمیں) : از پروفیسر عنایت علی خان۔ ناشر : اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ' لاہور۔ صفحات ۳۱ ۔ قیمت ۱۵ روپے۔

وضاحت

۱۔ ترجمان میں ترجیحاً دینی اور علمی کتابوں پر تبصرے شائع کیے جاتے ہیں۔
۲۔ تبصرے کے لیے کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں۔
۳۔ تبصرے کے لیے مطبوعات براہِ راست : مدیر "ترجمان القرآن" منصورہ' لاہور۔ ۵۴۵۷۰ کو بھیجی جائیں۔